Regd.L.No.7243

Phone

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1979

اس پرچہ میں :-

۱۔ آزادی کا قرآنی مفہوم

۲۔ روزوں کے قرآنی احکام

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ — لاہور

بدلِ اشتراک		
بدلِ اشتراک سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک - ۳ پونڈ	ٹیلی فون نمبر ۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی - گلبرگ ۲ - لاہور	قیمت فی پرچہ ۳ تین روپے
جلد ۳۲	اگست ۱۹۷۹ء	شمارہ ۸

فہرست

۱- لمعات ـ ـ ـ ـ (محترم پرویز صاحب) ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۲
(بہ سلسلہ - دین اور مذہب کی کشمکش)
۲- طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۱۵
۳- آزادی کا قرآنی مفہوم ـ ـ ـ (محترم پرویز صاحب) ـ ـ ـ ـ ـ ۱۷
یومِ آزادی، اگست ۱۹۷۹ء پر خطاب
۴- حقائق و عبر ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۴۱
(۱) یہ ہے ہماری صحافت! (۲) بالآخر اعتراف کرنا ہی پڑا
(۳) اہلِ حدیث کی طرف سے ... (۴) ہندی مسلمان
۵- قرآن ہر زمانے کے مطابق ہوتا ہے! ـ ـ ـ (آغا شورش کاشمیری مرحوم) ـ ـ ـ ۴۶
۶- احتساب (قسط ۸) ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۴۹
۷- روزہ کے احکام ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۵۷
۸- قرآنی درس کے اعلانات وغیرہ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۶۱

ایڈیٹر: محمد خلیل۔ ناشر: سراج الحق۔ مقامِ اشاعت ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر: شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ: علمی پرنٹنگ پریس، ۱۰ ہسپتال روڈ لاہور

لمعات

(بہ سلسلہ "دین اور مذہب کی کشمکش")

پرویز

طلوع اسلام بابت جون ۱۹۹۱ء میں جو میرا مقالہ بعنوان — دین اور مذہب میں کشمکش — شائع ہوا تو اس سلسلے میں مجھے بہت سے استفسارات موصول ہوئے ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ اب ملک میں ایسی فضا عام ہو رہی ہے جس میں دین سے متعلق بنیادی مسائل سے اس قدر دلچسپی لی جا رہی ہے۔ ان استفسارات میں بعض نکات ایسے ہیں جن کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یہ وضاحت بعض مثالوں کی رو سے زیادہ آسانی سے سمجھ میں آ سکے گی۔

قرآن کریم کی یہ آیت بڑی مشہور ہے اور اسے اکثر و بیشتر دہرایا جاتا ہے۔ یعنی:-

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (۲۹/۴۵)

عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "بے شک نماز برائیوں اور بے حیائیوں سے روک دیتی ہے"۔ لغت کی رو سے فحشا کے معنے بخل اور خود غرضی کے بھی ہیں اور منکر کے معنی عقل خود بین کی فریب کاریاں کے۔ لہٰذا اس آیت کا مفہوم یہ بھی ہوگا کہ یہ یقینی بات ہے کہ "الصلوٰۃ" خود غرضیوں اور فریب کاریوں سے روک دیتی ہے۔ مفہوم یہ ہو یا وہ، اس آیت میں حتمی اور یقینی طور پر کہا گیا ہے کہ "الصلوٰۃ" کا لازمی اور فطری نتیجہ یہ ہے کہ اول تو پورے کا پورا معاشرہ ورنہ کم از کم مصلی (نمازی) ہر قسم کی برائیوں، بے حیائیوں، خود غرضیوں اور فریب کاریوں سے رک جاتا ہے۔ اس سے ایسی حرکات سرزد ہی نہیں ہو سکتیں۔

یہ تو الصلوٰۃ کا منفی پہلو ہے۔ مثبت پہلو کے لئے اس حقیقت پر غور کیجئے کہ جب نماز کے لئے بلایا جاتا ہے (یعنی اذان دی جاتی ہے) تو بآواز بلند کہا جاتا ہے — حی علی الصلوٰۃ — "آؤ صلوٰۃ کی طرف" اور اگلے ہی سانس میں اس کی تشریح یہ کہہ کر دی جاتی ہے کہ حی علی الفلاح "آؤ کامیابیوں اور کامرانیوں کی طرف"۔ یہ اعلان درحقیقت قرآن مجید کی ان آیات کا ملخص ہے جن میں کہا گیا ہے: قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ اور هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُونَ (۲۳/۱-۲، ۹) یعنی یہ حقیقت ہے کہ مومنین جو صلوٰۃ کی پابندی کرتے ہیں وہ بڑی کامیاب زندگی بسر کرتے ہیں۔ انہیں ہر قسم کی فلاح و بہبود حاصل ہوتی ہے۔ ان کی کھیتیاں پھولتی پھلتی ہیں۔ (فلاح کے یہی معنے ہیں)

ان آیات — اور ان جیسی متعدد دیگر آیات — سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ الصلوٰۃ کا یقینی نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرہ ہر قسم کی برائیوں، بے حیائیوں، فریب کاریوں سے پاک اور صاف ہو جائے گا اور اسے فلاح و بہبود حاصل ہوگی۔ اجتماعی معاشرہ سے قطع نظر، کم از کم اتنا تو یقینی ہے کہ نمازیوں کی سیرت اس قسم کی تمام برائیوں سے پاک اور صاف ہوگی اور انہیں ہر قسم کی فلاح و

بہبود حاصل ہوگی۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہماری نمازیں یہ نتیجہ پیدا کر رہی ہیں؟ یعنی جو لوگ نماز پڑھتے ہیں کیا ان کی زندگی واقعی ایسی ہوتی ہے؟ اس کا جواب ہم سے نہیں' خود اس امام یا خطیب سے مانگیے جو نماز کے ہر اجتماع میں نمازیوں سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ "ہم میں برائیاں اور بے حیائیاں عام ہو رہی ہیں۔ ہم میں سیرت کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی نہیں رہی۔ اگر ہم ان فحشاء و منکرات سے باز نہ آئے تو ہم پر خدا کا غضب نازل ہو جائے گا" اس کے معنی یہ ہیں کہ ان نمازیوں کی نماز انہیں فحشاء و منکر سے نہیں روکتی۔ اس کے لئے انہیں الگ وعظ و نصیحت کرنی پڑتی ہے۔ اور یہ وعظ و نصیحت بھی اکثر و بیشتر بے نتیجہ ثابت ہوتی ہے۔ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہم میں سے ہر ایک کے سامنے ہے۔ یعنی :-

(۱) خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ الصلوٰۃ فحشاء و منکر سے روکتی ہے اور فلاح و بہبود کی ضامن ہوتی ہے۔

(۲) جو نمازیں ہم پڑھتے ہیں وہ یہ نتائج پیدا نہیں کرتیں۔

اس سے انسان لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ

(۱) یا تو (معاذ اللہ) خدا کا یہ دعدہ (بلکہ دعویٰ) غلط ہے کہ صلوٰۃ فحشاء و منکر سے روکتی ہے۔ اور یا

(۲) جو کچھ ہم صلوٰۃ کے نام سے کرتے ہیں وہ وہ صلوٰۃ نہیں جسے خدا نے متعین فرمایا ہے۔

اسلام کے متعلق ہم ساری دنیا میں اعلان کرتے ہیں کہ یہ سائنٹیفک نظام زندگی (دین) ہے۔ سائنٹیفک کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ "اگر یوں کرو گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا" —— اگر ہائیڈروجن اور آکسیجن کو ایک خاص تناسب کے ساتھ ملایا جائے تو اس سے پانی بن جائے گا۔ اگر پانی کو آگ پر رکھو گے تو وہ ایک خاص درجۂ حرارت پر پہنچ کر کھولنے لگ جائے گا اور پھر بھاپ بن کر اڑ جائے گا۔ اگر تندرست بیج کو مناسب زمین (SOIL) میں بو کر قاعدے کے مطابق پانی، روشنی اور حرارت کا انتظام کرو گے تو اس سے یقیناً کھیتی اُگے گی۔

اللہ تعالیٰ نے دین کے ہر حکم کے سلسلے میں کہا ہے کہ اس پر عمل کرو گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ سائنس کی زبان میں یوں کہا جائے گا کہ خدا کا ہر حکم ایک "فارمولا" ہوتا ہے جسے عمل میں لانے سے متعینہ نتیجہ برآمد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا ہے کہ اگر الصلوٰۃ کے "فارمولے" پر عمل کرو گے تو اس کا لازمی نتیجہ فحشاء و منکر کا انسداد اور فلاح و بہبود کا ضامن ہوتا ہے۔

اب اس مثال کو آگے بڑھائیے۔ بخار کے ایک مریض کے متعلق ڈاکٹری تشخیص یہ ہے کہ اسے ٹائیفائڈ ہے۔ اس کے لئے وہ دوائی کے کیپشولز تجویز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ چھ چھ گھنٹے کے بعد ایک کیپشول دیتے چلے جاؤ۔ اول تو چوبیس گھنٹے کے بعد' ورنہ زیادہ سے زیادہ چھتیس گھنٹے کے بعد' بخار نارمل ہو جائے گا۔ ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق ٹھیک ٹھیک عمل کیا جاتا ہے لیکن بخار ہے کہ نارمل تو ایک طرف' کم ہونے کا بھی نام نہیں لیتا۔ اس سے آپ کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں؟
اس نتیجے پر کہ

(۱) یا تو ڈاکٹر کی تشخیص غلط ہے۔

(۲) یا جو علاج تجویز کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں۔ اور

(۳) یا کیپشولز میں صحیح دوائی نہیں۔

آپ کبھی یہ نہیں کرتے کہ بخار بدستور ہے اور آپ وہی کیپسولز دیتے چلے جائیں۔ آپ مرض کی دوبارہ تشخیص کراتے ہیں۔ مرض وہی تشخیص ہوتا ہے لیکن پتہ چلتا ہے کہ کیپسولز کی شکل و صورت تو اصل جیسی تھی لیکن ان میں دوائی جعلی تھی اور بعض بالکل خالی تھے۔ آپ کبھی ایسا نہیں کرتے کہ انہی سابقہ کیپسولز کو دہرائے چلے جائیں۔ آپ صحیح کیپسولز حاصل کرتے ہیں اور ان کے صحیح ہونے کا معیار یہ قرار دیتے ہیں کہ ان سے مقررہ مدت کے اندر بخار اتر جائے۔

لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ہمارے مرض کا سبب فحشاء و منکر بتایا۔ اس کا علاج الصلوٰۃ تجویز کیا اور حتمی طور پر کہا کہ اس سے فحشاء و منکر کا سدِباب ہو جائے گا اور تمہیں فلاح و بہبود حاصل ہو جائے گی۔ لیکن ہم جس عمل کو صلوٰۃ (نماز) کہہ کر اس پر اس شد و مد سے کاربند ہوتے ہیں اس سے یہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اس سے فحشاء و منکر نہیں رک رہے۔ بایں ہمہ ہم ہیں کہ بجائے اس کے کہ ٹھہرے ہو کر سوچیں کہ غلطی کہاں ہے، اسی عمل کو دہرائے چلے جاتے ہیں۔

اتنا ہی نہیں۔ جب کہا جائے کہ معاشرہ میں فحشاء و منکر عام ہو رہے ہیں تو جواب دیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے نماز پڑھنی چھوڑ دی ہے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں نماز پڑھیں۔ یعنی کمی تعداد کی ہے کیپسولز میں کوئی نقص نہیں۔ لیکن جس خدا نے یہ کہا تھا کہ: اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ اسی نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (۲۹/۴۵) "جو کچھ تم مصنوعی طور پہ کرتے ہو، رسمی طور پر کرتے ہو میکانکی طور پر کرتے ہو اور مطمئن ہو جاتے ہو کہ ہم نے فریضہ صلوٰۃ ادا کر دیا ہے اللہ اس سے خوب واقف ہے"۔ وہ جانتا ہے کہ مصنوعی کیپسولز سے مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اس سے تو بلکہ موت واقع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ وَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ان نمازیوں کے لئے تباہی ہے۔ اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ۔ اَلَّذِیْنَ ھُمْ یُرَآءُوْنَ (۱۰۷/۴-۶) جو صلوٰۃ کے مقصد کو تو فراموش کر دیتے ہیں اور اس کی مرئی اور محسوس حرکات کو صلوٰۃ سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے منشاءِ خداوندی پورا کر دیا۔

میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ الصلوٰۃ کی شکل و صورت کس قسم کی ہونی چاہیئے۔ اس کی تفاصیل وغیرہ کیا ہونی چاہئیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس صلوٰۃ کا عملی نتیجہ تنھٰی عن الفحشاء و المنکر ہوگا وہ صلوٰۃ منشاءِ خداوندی کے مطابق ہوگی جس سے یہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا وہ "ما تصنعون" کے زمرے میں آتی ہے۔ ہمارے ہاں ایک جدید فرقہ (اہلِ قرآن) نے نماز کے اوقات اور دیگر جزئیات میں تبدیلیاں کیں۔ لیکن اس سے کون سا قرآنی مقصد حاصل ہو گیا؟ یاد رکھیئے! جن کیپسولز سے شفا نہ ہوتی ہو، انہیں تین بار دیجئے یا چھ بار۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جو دوائی کیپسولز کے اندر ہے وہ اصلی ہے یا نہیں۔ اور اس کے پرکھنے کا پیمانہ یہ ہے کہ اس سے وہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے یا نہیں جسے خدا نے خود متعین فرمایا ہے۔ آپ کو شکایت ہے کہ لوگ نماز نہیں پڑھتے لیکن آپ نے کبھی سوچا بھی ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ اس لئے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ جس نماز کی طرف آپ دعوت دیتے ہیں اس سے فحشاء و منکر کا سدِباب نہیں ہوتا۔ نمازیوں کی سیرت اور ان کا کردار اس کا بین ثبوت ہوتا ہے۔ آپ اس صلوٰۃ کا نظام قائم کیجئے جس سے فحشاء و منکر کا سدِباب ہو اور فلاح و بہبود کی فراوانیاں میسر ہوں پھر دیکھئے کہ لوگ کس طرح فوج در فوج اس کی طرف آتے ہیں (۱۱۰/۲)۔ جس دوائی سے مریض کو آرام آتا ہو وہ اس کے استعمال سے کبھی کوتاہی نہیں برتے گا۔ وہ تو اس کے وقت پہ آوازیں دے دے کر دوائی مانگے گا۔

اس کے جواب میں مذہبی پیشوائیت کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ یہ تو خدا کے احکام ہیں جن کی بلا چون و چرا تعمیل ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔ ان کے متعلق اس قسم کے سوالات اٹھانے ہی نہیں چاہئیں۔ ایسا کرنا ایمان کی کمزوری ہے۔

یہ درست ہے کہ یہ خدا کے احکام ہیں جن کی تعمیل ضروری ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مذہب کے خدا کے تصور اور دین کے خدا کے تصور میں زمین آسمان کا فرق۔ مذہب میں خدا کا تصور ایک ڈکٹیٹر کا سا ہوتا ہے۔ وہ جو جی میں آئے حکم دیتا ہے۔ نہ اس کی کوئی علت بتاتا ہے نہ غایت۔ بس اتنا کہتا ہے کہ تمہیں یہ حکم ماننا ہوگا۔ جو نہیں مانے گا اس کی کھال ادھیڑ دی جائے گی۔

اس کے برعکس دین (قرآن) کا خدا ہے جو ایک ناصح مشفق کی طرح نوعِ انسان سے کہتا ہے کہ تمہارے ہاں اس قسم کی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کے ازالہ کی یہ تدبیر ہے۔ اس کے مطابق عمل کرو گے تو اس سے تمہارا بھلا ہوگا۔ یعنی یہ خرابیاں دور ہو جائیں گی۔ ایسا نہ کرو گے تو تمہارا نقصان ہوگا۔ آپ دیکھئے۔ قرآن کریم میں احکام خداوندی کے ساتھ کہا جاتا ہے "لعلکم"۔ تم ایسا کرو تاکہ اس کا نتیجہ یہ نکلے۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۸۵/۷)۔ اس میں تمہارا اپنا ہی بھلا ہے۔ جامع طور پر ان الفاظ میں کہ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۔ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (۱۷/۷)" اگر تم اچھے کام کرو گے تو اس کا فائدہ تمہاری اپنی ذات کو پہنچے گا۔ اور اگر برے کام کرو گے تو ان کا خمیازہ بھی تم ہی بھگتو گے"۔ اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑے گا بلکہ اِنْ تَكْفُرُوْا اَنْتُمْ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۔ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِىٌّ حَمِيْدٌ (۱۴/۸)۔ "اگر تم اور تمہارے ساتھ تمام ساکنانِ ارض کفر اختیار کر لیں تو اس سے خدا کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ وہ تمہارے کفر و ایمان سے مستغنی ہے"۔ خدا کے احکام کی تعمیل ایسے ہی ہے جیسے (بلا تشبیہ) ڈاکٹری ہدایات کی پابندی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے احکام و ارشادات کو ہدایت سے تعبیر کیا ہے۔

لہٰذا، جب حکم دینے والے خدا نے کہہ دیا ہے کہ اگر تم اس کی تعمیل کرو گے تو اس کا نتیجہ تمہارے لئے منفعت بخش ہوگا، تو جب اس کے احکام کی تعمیل سے منفعت بخش نتائج سامنے آئیں گے تو دنیا لپک کر ان کی طرف آئے گی۔ یہی ہے وہ حقیقت جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۔ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ..... (۱۱۰/۱)" جب (تمہارے ایمان اور اعمال کے نتیجہ میں) خدا کی نصرت تمہارے شاملِ حال ہوگی اور فتح اور کامرانی تمہارے قدم چومے گی تو تم دیکھو گے کہ اقوام عالم کس طرح جوق در جوق دینِ خداوندی میں داخل ہوتی ہیں"۔ اور اگر تمہارے رسمی اور مصنوعی اعمال یہ نتیجہ پیدا نہیں کریں گے تو پھر نہ تمہارے وعظ و تلقین سے لوگ احکام خداوندی کی پابندی کریں گے ۔ نہ دنیا فوج در فوج حلقہ بگوشِ اسلام ہوگی۔

یہاں تک ہم نے صلوٰۃ کی بات کی تھی۔ اس کے بعد حج کی طرف آئیے جو ہمارا سب سے بڑا اور عالمگیر اجتماع ہے۔ اس اجتماع کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کو اس میں شرکت کی دعوت دو۔

لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (۲۲/۲۸)

تاکہ وہاں جا کر یہ اپنی منفعتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ یہ بتائی گئی ہے حج کی غایت ــــ اس اجتماع عظیم کا مقصد ــــ بلکہ اگر غور سے دیکھیں تو بات اس سے بھی زیادہ اہم سامنے آتی ہے۔ آیت کے شروع میں کہا گیا ہے:

وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ "تو لوگوں کو حج کے اجتماع میں شرکت کی دعوت دے"۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ منشائے خداوندی یہ تھا کہ اس اجتماع کا انصرام و اہتمام تو اُمّتِ مسلمہ کی طرف سے ہو لیکن اس میں دیگر اقوامِ عالم کے نمائندوں کو بھی مبصرین کی حیثیت سے دعوتِ شرکت دی جائے۔ تاکہ وہ اس امر کا مشاہدہ کریں کہ نظامِ خداوندی عالمگیر انسانیت کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ بہرحال اگر اسے اس طرح پھیلا کر نہیں بلکہ سمٹا کر بھی دیکھا جائے تو اتنا تو بالکل واضح ہے کہ اس سے مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کیا جا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا حج کے اجتماع میں یہ نظر آتا ہے کہ عالمِ انسانیت نہیں تو کم از کم اُمّتِ مسلمہ کی منفعت کے لئے کیا کچھ ہو رہا ہے؟ اس کا جواب ہر حاجی دے سکتا ہے۔ وہ محض اپنی عقیدتمندی سے اس فریضہ کو رسمی طور پر ادا کر کے چلا آتا ہے۔ اسے وہاں مَنَافِعَ لَهُمْ کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ قرآن کریم نے لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ مشاہدہ کوئی نظری یا محض اعتقادی شے نہیں ہوتا۔ ایسا تو منفعتوں کے مرئی اور محسوس طور پر سامنے آنے کے لئے کہا جائے گا۔

اس سے واضح ہے کہ ہمارے موجودہ حج سے بھی وہ مقصد حاصل نہیں ہو رہا جسے اللہ تعالیٰ نے اس کی غایت بتایا ہے۔ ہم ہر سال بڑے فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ امسال اتنے لاکھ حاجیوں نے اس فریضہ کو ادا کیا۔ لیکن اس پر کبھی غور نہیں کرتے کہ اس کا جو مقصد اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کیا وہ بھی حاصل ہوا؟ اگر نہیں ہوا تو یہ بھی صلوٰۃ کی طرح محض ایک رسمی عمل بن کر رہ گیا ہے۔ یہ دس لاکھ کے بجائے پچاس لاکھ پر بھی مشتمل ہو جائے، تو بھی ایک رسم کی ادائیگی ہو گی۔ منشاءِ خداوندی کے مطابق تو وہ صحیح ہو گا جس میں عالمگیر انسانیت، یا بہ سبیلِ تنزل اُمّتِ مسلمہ کی منفعت مشہود طور پر سامنے آ جائے۔

اسلام کا تیسرا رکن صوم ہے جسے روزہ کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فریضہ کی ادائیگی کا نتیجہ یہ بتایا:۔

لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ (۲/۱۸۵)

تاکہ تم اس راہنمائی کی رو سے جسے اللہ نے عطا کیا ہے، اس کی کبریائی کو دنیا میں ثبت کر سکو۔

کبریائی کے معنی ہیں غلبہ، حکومت، اقتدارِ مطلق وغیرہ۔ قرآن کریم میں ہے: وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۴۵/۳۷) "خارجی کائنات اور انسانی دنیا میں کبریائی اسی کو حاصل ہے۔ وہی صاحبِ غلبہ ہے اور اس کا غلبہ حکمت پر مبنی ہے، دھاندلی پر نہیں"۔ خارجی کائنات میں اس کی کبریائی از خود قائم ہے لیکن انسانی دنیا میں یہ کبریائی انسانوں کے ہاتھوں سے قائم ہو گی۔ چنانچہ نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا کہ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (۷۴/۳) "اور دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کرو۔ خدا کی کبریائی قائم ہونے کا عملی مفہوم کیا ہے اس کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی کہ فَالْحُكْمُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ (۴۰/۱۲)۔ "چونکہ غلبہ اور کبریائی کا مستحق خدا ہے اس لئے حکومت صرف اسی کی قائم ہونی چاہیئے"۔ اور خدا کی حکومت کی وضاحت ان الفاظ سے کر دی کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ (۵/۴۸) "ان کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو"۔ بالفاظِ دیگر، خدا کی کبریائی کا عملی مفہوم یہ ہے کہ جس طرح خارجی

کائنات میں قوانینِ خداوندی کی حکمرانی ہے اسی طرح انسانی دنیا میں بھی اسی کے قوانین کی حکمرانی ہو۔ اسی کو الدّین یا نظامِ خداوندی کہہ کر پکارا گیا ہے اور اس نظام کے متعلق کہا گیا ہے: لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (۹/۳۳) "یہ نظام انسانوں کے وضع کردہ تمام نظاموں پر غالب آکر رہے گا۔"

یہ تھی غایت صیام کی۔ یعنی کتاب اللہ کی حکمرانی کو اس طرح قائم کرنا کہ کوئی اور نظام اس پر غالب نہ آسکے۔ صیام سنہ ۲ھ میں فرض ہوئے اور جماعت مؤمنین نے ابھی ایک دفعہ روزے رکھے تھے کہ انہیں بدر کی رزمگاہ میں اترنا پڑا۔ مقصد اس سے کیا تھا — جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا (۹/۴۰) "تاکہ مخالفین کا نظام مغلوب ہو جائے اور اللہ کا نظام غالب آجائے۔ یہ باطل کے نظام کے خلاف پہلا تصادم تھا اور اس پر غلبہ۔ اس کے بعد صیام پر عمل کرنے والی اس امت نے اُس دور کے ہر نظام پر غلبہ حاصل کر لیا اور اس طرح لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ کا عملی ثبوت بہم پہنچا دیا۔ "اللہ اکبر" اس نظام کا ماٹو یا منشور تھا اور ساری دنیا نے دیکھ لیا تھا کہ اس کا عملی مفہوم کیا ہے۔

ذرا سوچئے کہ کیا ہمارے روزوں سے یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ دنیا میں کتاب اللہ کی حکمرانی غالب ہو اور جب ہمارا مؤذن مینار پر کھڑا ہو کر دن میں لاکھوں، کروڑوں مساجد سے کم از کم پانچ مرتبہ اعلان کرے کہ اللہ اکبر، تو وہ ایک واقعہ کا اعلان ہو نہ کہ محض چند الفاظ کا دہرا دینا؟ ان ملکوں کو تو چھوڑیئے جہاں غیر مسلموں کی حکومت قائم ہے کیا مسلم ممالک میں کوئی ایک ملک بھی ایسا ہے جہاں اللہ اکبر ایک حقیقت کا اعلان ہو۔ جہاں کبریائی واقعی خدا کی ہو۔ جہاں حکمرانی اس کی کتاب کی ہو۔ کیا یہ اللہ اکبر کا محض لفظی تکرار اور اس کی عملاً نفی نہیں؟

یہاں تک تو دینِ خداوندی کے دو اہم ارکان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہ حیثیت مجموعی اس دین کے پیروؤں کے متعلق فرمایا ہے:-

(۱) حَقًّا عَلَيْنَا نُنجِ الْمُؤْمِنِينَ (۱۰/۱۰۳) "انہیں ہر قسم کی مصیبت اور پریشانی سے محفوظ رکھنا خدا پر واجب ہے۔" خدا نے یہ ذمہ داری اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ (ضمناً) "حقاً علینا" کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ ہم ہمیشہ حقوق اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ یعنی اللہ کے حقوق جو ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں خدا نے مؤمنین کے ایک حق کا ذکر کیا ہے جسے خود خدا نے اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ بڑی اہم بات ہے۔

(۲) وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (۳۰/۴۷)۔ یعنی مؤمنین کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے اس فریضہ کو ادا کرے گا تو اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا فرمایا:-

(۳) وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (۴/۱۴۱) "یہ ناممکن ہوگا کہ غیر مسلم مسلمانوں پر غالب آسکیں۔" مؤمنین کی تو کیفیت یہ ہوگی کہ

(۴) وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (۳/۱۳۸) "تم کیوں گھبراتے ہو۔ کیوں افسردہ خاطر ہوتے ہو۔ تم تو مؤمن ہو اس لئے تمہیں تمام اقوامِ عالم پر غلبہ حاصل ہوگا۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸)۔ تمہیں نہ کسی سے خوف کھانے کی کوئی وجہ ہے نہ ہی ملولِ خاطر ہونے کی۔

یہ تھی معیار اس بات کے پرکھنے کے کہ ہم اسلام کے پیرو (مومن) ہیں یا نہیں۔ قرآن کریم نے یہ دعاوی محض نظری طور پر پیش نہیں کئے تھے۔ ان کی صداقت کا ثبوت عملاً سامنے آگیا تھا۔ عہدِ اوّل کے مسلمانوں کے اجزائے ایمان وہی تھے جو ہمارے ہیں۔ یعنی اللہ پر ایمان، کتابوں پر ایمان، ملائکہ پر ایمان اور حیاۃ آخرت پر ایمان۔ ان کا پروگرام بھی انہی ارکان پر مشتمل تھا جو ہمارے ہاں رائج ہیں —— یعنی صلوٰۃ، صیام، حج، زکوٰۃ وغیرہ۔ اس ایمان اور ان ارکان پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ کیا تھا؟ اسے ایک ایرانی گورنر نے ایسے جامع اور مانع الفاظ میں بیان کیا تھا جس پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ جب ایران فتح ہوا تو تستر کا گورنر ہرمزان، قیدی کی حیثیت سے حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا۔ آپ نے اس سے کہا کہ ہرمزان! قید و بند کی بات تو بعد میں ہوگی۔ تم پہلے میرے ایک سوال کا جواب دو جو بڑا اہم اور بنیادی ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ:-

اس سے پہلے تم ایرانی ہم عربوں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے تھے تم ہمیں اس قدر ذلیل اور حقیر سمجھا کرتے تھے کہ دوستی تو ایک طرف تم ہمارے ساتھ جنگ کرنے کو بھی اپنے لئے باعثِ ننگ سمجھا کرتے تھے۔ اب وہی تم ہو اور وہی ہم۔ تو پھر یہ کیا ہوا جو تم نے ہمارے ہاتھوں اس قدر ذلت آمیز شکست کھائی ہے۔ ملک تمہارا ختم ہوگیا۔ مملکت تمہاری تباہ ہوگئی۔ تمہاری تہذیب اور تمدن جس پر تمہیں اس قدر ناز تھا خاک میں مل گئے۔ تم (گورنر) میرے سامنے پابجولاں کھڑے ہو اور تمہارا شہنشاہ اپنی جان بچانے کے لئے مارے مارے پھر رہا ہے۔ یہ انقلاب کیسے ہوگیا؟ اس کی وجہ کیا ہوئی؟

سوال آپ نے سن لیا۔ اب ہرمزان کا جواب سنیئے۔ اس نے کہا:-

عمرؓ! بات یہ ہے کہ اس سے پہلے تم اور ہم اکیلے ایک دوسرے سے نمٹتے تھے۔ اس لئے ہم ہمیشہ تم پر غالب آجاتے تھے۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ مقابلہ کے وقت ہم تو بدستور اکیلے ہوتے ہیں لیکن تمہارے ساتھ تمہارا خدا بھی ہوتا ہے۔ ہمارے لئے کیا، دنیا کی کسی طاقت کے لئے بھی ممکن نہیں کہ تم دونوں کا مقابلہ کرسکے۔ (شاہکارِ رسالت، صفحہ ۱۳۳)

یہ تھا عملی ثبوت خدا کے ان دعووں کی صداقت کا جن کی رو سے اس نے کہا تھا کہ اگر تم ہماری ہدایات کے مطابق عمل کروگے تو تمہاری نصرت ہم پر واجب ہو جائے گی اور دنیا کی کوئی قوم تم پر غالب نہیں آسکے گی۔ آج ہمارے اجزائے ایمان بھی وہی ہیں اور اسلام کے ارکان و شعائر بھی وہی۔ اگر تمام کے تمام مسلمان نہیں تو بھی ان کا ایک معتدبہ حصہ ان کی پابندی کرتا ہے۔ ان کی مجموعی تعداد ابتدائی دور کے تمام مسلمانوں کی تعداد سے بھی زیادہ ہوگی۔ لیکن اس کے باوجود ہماری جو حالت ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اقوامِ عالم پر غلبہ تو ایک طرف۔ ہم بعض قوموں کے دست نگر ہیں! ان کے اشاروں پر چلنے کے لئے مجبور ہیں۔ اور بعض سے اس قدر خائف کہ قرآن کریم کے الفاظ میں: يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ (۶۳/۴) کہیں کوئی پتہ بھی کھڑکے تو ہماری جان پر بن جاتی ہے۔ اس وقت دنیا کی کوئی قوم اس قدر خوف اور حزن، پریشانی اور مایوسی کا شکار نہیں جتنی مسلم اقوام ہیں۔ (معاف فرمایئے) مسلم کے ساتھ اقوام کا لفظ واقعہ کے طور پر لکھنا پڑتا ہے ورنہ مسلم تو امتِ واحدہ ہوتے ہیں۔ اقوام میں بٹے ہوئے نہیں ہوتے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ ہم نے اجزائے ایمان (یعنی بنیادی نظریاتِ زندگی) کے صرف الفاظ دہرانے اور

اور ارکانِ دین کی صرف رسمی شکلیں (RITUALS) قائم رکھنے کا نام اسلام رکھ چھوڑا ہے۔ ہم نے کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ یہ دیکھیں کہ اس ایمان اور ان اعمال کا جو حتمی اور یقینی نتیجہ خود خدا نے بتایا تھا وہ برآمد ہو رہا ہے یا نہیں۔ وہ برآمد نہیں ہو رہا، لیکن ہم انہیں برابر دہراتے چلے جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے بہت پہلے ہمارا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا کہ: قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا (۱۸/۱۰۳) "اے رسول! ان سے کہو کہ کیا ہم تمہیں بتائیں کہ سب سے زیادہ نقصان میں کون لوگ رہتے ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو کچھ کرتے نہیں یعنی کرنے کو تو یہ بہت کچھ کرتے ہیں لیکن الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا (۱۸/۱۰۴)" ان کی ساری کوششیں رائگاں چلی جاتی ہیں۔ وہ یہ سب کچھ محض رسمی طور پر کرتے رہتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ ہم بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ وہ کبھی نہیں سوچتے کہ ہمارے ان کاموں کا کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہو رہا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ " ان کا تمام کیا کرایا رائگاں چلا جاتا ہے۔ وہ عبث اور بیکار ہوتا ہے، اس قدر عبث اور بیکار کہ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا (۱۸/۱۰۵)۔ اس جنس کا سر کے تولنے کے لئے میزان تک کھڑی کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

لہٰذا، قرآن کریم نے ہماری تباہی کا بنیادی سبب خود ہی واضح کر دیا۔ یعنی اسلامی احکام کو محض رسمی طور پر بجا لاتے چلے جانا اور کبھی اس پر غور نہ کرنا کہ ان سے وہ نتائج بھی مرتب ہو رہے ہیں یا نہیں جنہیں ان کا لازمی نتیجہ قرار دیا گیا تھا۔ دین میں یہی اعمال اپنا متعینہ نتیجہ مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور مذہب میں یہ محض رسم بن کر رہ جاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا ایک مذہب پرست قوم میں دین کے نظریات از سرِ نو زندگی اور توانائی حاصل کر سکتے ہیں؟

علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں اس موضوع پر بڑی عمیق، فکر انگیز اور عبرت آموز بحث کی ہے۔ وہ پہلے کہتے ہیں کہ اس قسم کی قوم کے مذہبی پیشوا، اس دور کی درخشندہ داستانیں جس میں دین کے اعمال نتیجہ خیز ہوتے تھے، دہرا دہرا کر قوم کو سہانے خوابوں میں سلائے رکھتے ہیں۔ لیکن یاد رکھئے:۔

> قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیا سے نہیں ہو سکتا (آکسفورڈ ایڈیشن صفحہ ۱۴۴)

اس کے بعد انہوں نے ایک ایسی بات کہی ہے جو ہر صاحبِ فکر و احساس کے لئے نہایت گہرے غور و تدبر کی متقاضی ہے۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر میں اُسے ان کے اصل الفاظ میں درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں:۔

THE VERDICT OF HISTORY, AS A MODERN WRITER HAS HAPPILY PUT IT, IS THAT WORN OUT IDEAS HAVE NEVER RISEN TO POWER AMONG A PEOPLE WHO HAVE WORN THEM OUT (P. 144)

یعنی عصرِ حاضر کے ایک مصنف نے کیسی پتے کی بات کہی ہے کہ:۔

> "تاریخ کا فیصلہ ہے کہ جن نظریات اور تصورات کو کسی قوم نے فرسودہ کر دیا ہو وہ اس قوم میں پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے" (صفحہ ۱۴۴)

یہ کون سی قومیں ہیں جن کی طرف اس دیدہ ور مصنف نے اشارہ کیا ہے؟ یہ وہی قومیں ہیں جو دین کو مذہب میں

تبدیل کر دیتی ہیں۔ دین کے بنیادی نظریات اور تصورات بے پناہ قوتوں کے حامل ہوتے ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونے والی قوم میں ان قوتوں کا اس طرح مظاہرہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا اس کا مشاہدہ کرتی ہے۔ اس کے بعد اس قوم کے اخلاف ان نظریات کے الفاظ کو دہراتے رہتے اور دین کے ارکان پر محض رسمی طور پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ اس سے یہ نظریات اپنی توانائی کھو دیتے اور چلے ہوئے کارتوس بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہ ہے وجہ، یا بالفاظ دیگر کہنا یہ ہے کہ :-

تاریخ کا فیصلہ ہے کہ مذہب پرست اقوام میں دین کا احیاء نہیں ہو سکتا۔

اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر قوم کی طرف اپنے رسول بھیجے۔ ہوتا یہ کہ ایک رسول آتا اور اپنی قوم کو زندگی بخش نظریات دیتا اور ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق بتاتا۔ وہ ان کے مطابق عمل کرتے تو زندگی کی سرفرازیاں اور خوشگواریاں ان کے قدم چومتیں۔ اسے دین یا نظام خداوندی کہا جاتا۔ اس نظام میں انسانوں کی حکمرانی کے لئے کوئی گنجائش ہوتی نہ سرمایہ داری کے لئے اور نہ ہی اس میں مذہبی پیشوائیت کا عمل دخل ہوتا۔ اس میں اطاعت صرف احکام و قوانین خداوندی کی ہوتی۔ وہ رسول چلا جاتا تو طاغوتی قوتیں پھر سر اٹھاتیں اور مذہبی پیشوائیت ان کی سرخیل ہوتی۔ اس کی تکنیک یہ ہوتی کہ وہ دین کے نظریات کے الفاظ اور اس کے ارکان کی شکل و صورت (FORM) بدستور قائم رکھتی لیکن ان کے معانی اور مفہوم یکسر بدل دیتی۔ مفہوم کے بدلنے میں بنیادی حربہ یہ استعمال کیا جاتا کہ ان نظریات اور اعمال کو ان کے نتائج سے پرکھنے کا تصور ختم کر دیا جاتا اور انہیں رسمی طور پر ادا کئے جانے کو مقصد قرار دے دیا جاتا۔ اکثر و بیشتر رسول کی عطا کردہ وحی کے الفاظ میں بھی تحریف کر دی جاتی یا آمیزش۔ اس طرح دین، مذہب میں بدل جاتا۔

اس کے بعد ایک اور رسول آتا اور دین کے حقیقی نظریات اور ان کے عوامل ان کے سامنے پیش کرتا۔ مذہبی پیشوائیت اچھی طرح جانتی کہ یہ مذہب کو دین میں تبدیل کر دینے کی کوشش ہے لہٰذا اس کی طرف سے اس دعوت کی سخت مخالفت ہوتی۔ وہ اس (رسول) سے کہتے کہ آپ کون سی ایسی بات لے کر آئے ہیں جو ہمارے پاس پہلے سے موجود نہیں؟ ہم خدا کو مانتے ہیں، اس کے رسولوں کو مانتے ہیں، وحی کو مانتے ہیں، آخرت کو مانتے ہیں۔ تم بھی انہی پہ ایمان لانے کے لئے کہتے ہو۔ ہم خدا کی پرستش کرتے ہیں، یہی تعلیم تم دیتے ہو۔ پھر ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم اپنی اس روش کو چھوڑ کر جو ہمارے اسلاف سے مسلسل چلی آ رہی ہے تمہارے پیچھے لگ جائیں؟ اس رسول اور اس کی قوم میں یہ کشمکش جاری رہتی۔ ان میں سے بعض سعادت مند افراد جو دین اور مذہب کے فرق کو پہچان لیتے اس رسول کی دعوت کو قبول کر لیتے۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا کہ یہ رسول اپنی اس مختصر سی جماعت کو اپنے ساتھ لے کر کسی ایسے مقام کی طرف ہجرت کر جاتا جو نظام خداوندی کے قیام کے لئے زیادہ سازگار ہوتی۔ اس طرح وہاں دین متشکل ہو جاتا۔

اور جب وہ رسول چلا جاتا تو اس قوم کی پھر وہی حالت ہو جاتی۔ یعنی ان پر پھر مذہب مسلط ہو جاتا۔ اس تبدل و تحول کی بین مثال حضور نبی اکرمؐ کی دعوت ہے۔ حضورؐ کے مخاطب قریش بھی تھے جو کسی مذہب کے پیرو نہیں تھے اور یہودی، نصرانی اور کسی حد تک مجوسی بھی جن کے ہاں دین کی جگہ مذہب رائج تھا۔ انہیں قرآن "اہل کتاب" کہہ کر پکارتا ہے۔ حضورؐ کی دعوت کی مخالفت تو ان سب کی طرف سے ہوئی لیکن اس مخالفت کے اسباب و وجوہ مختلف تھے۔ قریش کی مخالفت بربنائے مذہب نہیں تھی لیکن اہل کتاب کی مخالفت مذہب کی بنا پر تھی۔ نتیجہ یہ کہ شدید مخالفت کے بعد

ہی سہی) قریش تو اس دعوت کے پیرو ہو گئے لیکن اہلِ کتاب میں سے (باستثناء چند) کسی نے اسے قبول نہ کیا اور اپنے اپنے مذہب کے پابند رہے۔ دین کا قیام اُسی طبقہ میں ہوا جو مذہب پرست نہیں تھا۔ یوں دین کے نظریات اس قوم میں توانائی حاصل نہ کر سکے جس نے انہیں فرسودہ کر دیا تھا۔

نبی اکرمؐ اس جماعتِ مؤمنین کو، دین پر کاربند ہونے کی بناء پر، دعوتِ دین کے وارث بنا کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد، مذہب پرست قوتوں (ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت) نے سر ابھارا، اور آہستہ آہستہ دین کو مذہب میں تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح دین کے آثار مدھم پڑتے چلے گئے اور مذہب کی گرفت محکم سے محکم تر ہوتی گئی کیونکہ اس کی پشت پر ملوکیت اور سرمایہ داری کی تائید اور قوت تھی۔ صدرِ اوّل کے چند لمحات کو چھوڑ کر ہماری ساری تاریخ مذہب کی تاریخ ہے، اور جس جد و جہد کو اسلامی کہہ کر پکارا جاتا ہے وہ درحقیقت مذہب کی گرفت کو محکم کرنے کی کوششیں ہیں۔ یہ کیفیت آج تک چلی آ رہی ہے۔

رسول اللہؐ کے بعد کسی رسول نے آنا نہیں کیونکہ حضورؐ پر سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا ہے۔ سلسلۂ نبوت کو جاری رکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ دین کا ضابطہ اپنی مکمل اور غیر متبدل شکل میں خدا کی کتاب کے اندر محفوظ ہے اور تمام اقوامِ عالم کے لئے یکساں آئینِ حیات۔ جو قوم چاہے اسے اختیار کر کے اس کے زندگی بخش نتائج سے متمتع ہو سکتی ہے۔ یوں جو قوم چاہے اس کے ہاں دین کا احیاء ہو سکتا ہے۔ اس لئے اجرائے نبوت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ کسی مذہب پرست قوم میں دین کا احیاء نہیں ہو سکتا۔ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔ ہندو مت کے متعلق تو کہا نہیں جا سکتا کہ اس کی عمر کتنی ہے۔ اس کے پیرو اسے ازلی قرار دیتے ہیں۔ اس کی عمر کتنی ہی ہو، ان کے ہاں دین کا احیاء نہیں ہو سکا۔ چین اور جاپان کے مذاہب کی بھی یہی کیفیت ہے۔ بدھ مت اور جین مت ان سے کم عمر ہیں لیکن ہیں یہ بھی قدیم مذہب۔ ان میں بھی کہیں زندگی کی نمود نظر نہیں آتی۔ سامی مذاہب میں یہودیت زیادہ قدیم اور عیسائیت اس سے عمر میں کم ہے لیکن ان کے ہاں بھی دین کا احیاء نہیں ہوا۔ قدیم مذاہب میں سے اکثر زمانے کے تقاضوں کی تاب نہ لا کر مٹ چکے ہیں۔ باقی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر قبر کی جانب گھسٹتے چلے جا رہے ہیں۔ انہیں پھر سے زندگی اور توانائی نصیب نہیں ہو سکی۔ یوں تاریخ کا یہ فیصلہ ایک حقیقت بن کر ہمارے سامنے آ جاتا ہے کہ

جن نظریات اور تصورات کو کسی قوم نے فرسودہ کر دیا ہو وہ اس قوم میں پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے۔

مذاہبِ عالم میں اسلام کی عمر سب سے کم ہے لیکن تاریخ کے مذکورہ بالا فیصلے کا اس پر بھی یکساں اطلاق ہو رہا ہے۔ اس مذہب کے پیرووں (یعنی ہم مسلمانوں) کو زندگی کی وہ سرفرازیاں نصیب ہی نہیں ہوئیں جن کا مظاہرہ دین کے آغاز کے زمانے میں ہوا تھا۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، ہماری طرف کسی نبی نے آنا نہیں تھا۔ دین کی طرف دعوت کا فریضہ رجوع الی القرآن کے ذریعے (غیر نبی) انسانوں کی طرف سے ادا ہونا تھا۔ لیکن جیسا کہ دیگر مذاہب کے سلسلہ میں ہوا، جب بھی قرآن کی دعوت دی گئی، مذہب پرست قوتوں نے اسے کچل کر رکھ دیا۔ یہ ہماری تاریخ کا بڑا دردانگیز اور المناک باب ہے لیکن اس کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے احیاءِ دین کی ایک سکیم سوچی یعنی انہوں نے سوچا کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کیا جائے جہاں مذہب کی حکمرانی نہ ہو۔ اس خطۂ زمین میں قرآنی نظام نافذ کر دیا جائے اور اس طرح دین کا احیاء عمل میں آ جائے۔ غور سے دیکھئے تو یہ اسکیم "زمانۂ حاضرہ کے احوال و ظروف کی روشنی میں" ہندی

مسلمانوں کے لئے "ہجرت" کے مترادف تھی۔ قائد اعظمؒ کی کوششوں نے اس خطۂ زمین کے حصول کو ممکن بنا دیا۔ آپ علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کے ارشادات پر غور کیجئے۔ وہ بار بار کہتے تھے کہ پاکستان میں قرآنی نظام قائم کیا جائے گا۔ اس میں تھیوکریسی کو کسی صورت میں بھی دَر بہ عمل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ ان کی عمروں نے ایفا نہ کیا اور پاکستان میں نتیجہ اس کے بالکل برعکس برآمد ہو گیا یا ہو رہا ہے۔ غیر منقسم ہندوستان میں اسلام ایک انفرادی مذہب کی حیثیت میں رائج تھا۔ یہاں وہی مذہب تھیاکریسی کی شکل اختیار کئے جا رہا ہے۔

خواستم پیکاں برآرم ، در جگر نشتر شکست!

علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کے بعد دین اور مذہب کے فرق کو نمایاں طور پر پیش کرنے کا فریضہ میں نے اپنے ذمے لیا لیکن جس انداز سے اور جس ملک گیر پیمانے پر مذہبی پیشوائیت کی طرف سے میری مخالفت ہوئی اور ہو رہی ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں نہ کوئی "مامور من اللہ" ہوں۔ نہ میرا کسی قسم کا دعویٰ ہے۔ میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں اور قوم سے صرف اتنا کہتا ہوں کہ

جو کچھ آپ اسلام کے نام سے کہتے اور کرتے ہیں، اس کے متعلق یہ دیکھ لیجئے کہ اس کے وہ نتائج جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بتائے ہیں وہ برآمد ہو رہے ہیں یا نہیں! اگر نہیں ہو رہے (اور ہم سب اس کا رونا روتے رہتے ہیں) تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ منشاءِ خداوندی کے مطابق نہیں۔ لہٰذا، اسے منشاءِ خداوندی کے مطابق بنائیے۔

یہ ہے جو کچھ میں کہتا ہوں۔ لیکن چونکہ مروّجہ اسلام کو اس معیار کے مطابق پرکھنے سے مذہب کی شکست ہی نہیں، اس کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے ـــــ یعنی اس کی جگہ دین لے لیتا ہے ـــــ اس لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس کی مخالفت تاریخ کا فطری عمل ہے۔ لیکن میری اس مخالفت سے حقائق تو نہیں بدل سکتے۔ مذہب نے جو کچھ دوسری قوموں کے ساتھ کیا ہے وہی کچھ ہمارے ساتھ ہو گا (اور ہو رہا ہے)۔

جب مذہب کے پیدا کردہ اسباب کی رو سے قوم کی حالت ابتر ہو جاتی ہے، تو مذہبی پیشوائیت شور مچا دیتی ہے کہ

(۱) مسلمانوں نے مذہب کو چھوڑ دیا ہے اس لئے ان کی یہ حالت ہو گئی ہے اور

(۲) الحاد اور بے دینی کی قوتیں زور پکڑ رہی ہیں جس سے اسلام خطرہ میں ہے

جہاں تک الحاد اور بے دینی کی قوتوں کے زور پکڑنے کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا تھا: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (۴/۱۴۱) "یہ ناممکن ہے کہ اللہ غیر مسلموں کو مؤمنین پر غالب آجانے دے"۔ اگر آپ مؤمن ہیں تو پھر الحاد و بے دینی کی قوتوں سے اس قدر خائف کیوں ہیں؟ اور اگر آپ خائف ہیں تو، بجائے اس کے کہ یہ دہائی مچائیں کہ الحاد و بے دینی کی قوتیں زور پکڑ رہی ہیں، دیانتداری سے اعلان کیجئے کہ ہم مؤمن نہیں ہیں۔ لیکن مذہبی پیشوائیت دوسروں کو تو کافر قرار دے دے گی، اپنے متعلق اس اعتراف اور اعلان کی جرأت کبھی نہیں کرے گی۔ اقبالؒ کے لفظوں میں:۔

ز دوزخ واعظ کافر گرے گفت	حدیثے خوشتر از وے کافرے گفت
"نداند آں غلام احوال خود را	کہ دوزخ را مقام دیگرے گفت"

(ارمغانِ حجاز)

اب رہا ان کا یہ کہنا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ مذہب پرست بن جائیں، یعنی جو کچھ مذہب کے نام سے اس وقت ہو رہا ہے، اس پر اور کثرت اور شدت سے عمل کیا جائے۔ بالفاظ دیگر ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر میدانِ کارزار میں ایک سو چلے ہوئے کارتوسوں سے کامیابی حاصل نہیں ہوتی تو ان کی تعداد بڑھا کر ہزار تک پہنچا دی جائے۔ انہیں کون بتائے کہ عرصۂ کارزار میں ایک بھرا ہوا کارتوس دس ہزار خالی کارتوسوں پر بھاری ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے جب کہا تھا کہ تمہارا ایک سو مجاہد فریقِ مخالف کے ایک ہزار پر غالب آ جائے گا (۸/۶۶) تو اس سے یہی بتانا مقصود تھا۔ یاد رکھئے! مذہب کی نشر و اشاعت سے دین کے نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس مذہب جتنا زیادہ پھیلے گا قوم اتنی ہی زوال پذیر ہو گی۔ علامہ اقبالؒ کی ساری عمر مذہب اور دین کے فرق کو نمایاں کرنے میں بسر ہو گئی۔ انہوں نے جو کچھ مُلّا کے خلاف لکھا ہے، وہ درحقیقت اس کے رسمی اسلام (یعنی مذہب) کے خلاف تنقید ہے۔ کبھی وہ کہتے ہیں کہ ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں، لیکن — مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اور کبھی یہ کہ ؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست — یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

اور کبھی یوں پکار اور ابھار کر کہ ؎

نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے

اس احساس سے ان کے قلب درد آگیں میں ایسی ٹیس اٹھتی ہے کہ وہ بصد نالہ و فغاں پکارتے ہیں کہ

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا — کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی

یہ "حجاب آمیزی" دین کے رُخ پر پڑے ہوئے مذہب کے دبیز پردوں کا دوسرا نام ہے۔

ظاہر ہے کہ اقبالؒ کی اس قسم کی بیدردی مذہبی پیشوائیت کو کبھی گوارا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے انہوں نے ان کے خلاف کفر کے فتوے لگانے میں بھی احتراز نہ کیا۔ لیکن انہوں نے اس پر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو بس اتنا کہ ؎

گفتم حضرتِ مُلّا ترش رو ست — نگاہش مغز را نشناسد از پوست
اگر با این مسلمانی کہ دارم — مرا از کعبہ می راند حق اوست (ارمغانِ حجاز)

چونکہ تاریخ کا وہ فیصلہ جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے، اور قرآن کریم میں بیان کردہ مذہب پرست اقوام کا عبرتناک انجام ان کے سامنے تھا اس لئے وہ علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ اسلام "الدین" کی شکل میں موجودہ مسلمانوں میں جن پر مذہبی پیشوائیت اس بری طرح مسلط ہے زندہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے انہوں نے بڑی حسرت و یاس لیکن اس کے ساتھ ہی دین کے مستقبل کے متعلق بڑا امید اور یقین کہا کہ

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است — سازِ قرآں را نواہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر — آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور

حق اگر از پیش ما بردارد ش   پیش قومے دیگرے بگذاردش

از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن   ہر زماں جانم بلرزد در بدن

ترسم از روزے کہ محرومش کنند

آتش خود بر دلِ دیگر زنند   (جاوید نامہ)

اور یہ خود قرآن کی اس آیت کی ترجمانی ہے جس میں مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا تھا کہ

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸)

اگر تم نے قرآن سے روگردانی کی تو وہ تمہاری جگہ ایک اور قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

یہ وہ قوم ہوگی جس میں قرآنی نظریات کے الفاظ دہرانے کا نام ایمان نہیں ہوگا۔ اس کے نزدیک ان نظریات کے نتائج کی صداقت پر یقینِ محکم کا نام ایمان ہوگا۔ اس کے ہاں اسلام کے ارکان اور شعائر کی رسمی پابندی فریضۂ خداوندی کی ادائیگی نہیں ہوگی۔ وہ قدم قدم پر رک کر دیکھے گی، سوچے گی اور اس امر کا جائزہ لے گی کہ ان سے وہ نتائج مرتب ہو رہے ہیں یا نہیں جن کا وعدہ خدا نے کر رکھا ہے۔ وہ اسلام کی اشاعت لفظی مناظروں اور نظریاتی کانفرنسوں کے ذریعے نہیں کرے گی بلکہ اقوامِ عالم کو چیلنج دے گی کہ

اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۱۳۵)۔

تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو، ہمیں اپنے نظام کو روبہ عمل لانے دو۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ آخر الامر کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے۔ اور اس بات کو تو ابھی سے سن رکھو کہ جس نظام کی بنیاد ظلم و استبداد پر ہوگی اسے کبھی کامیابی نصیب نہیں ہو سکے گی۔

اس عملی پروگرام کی رو سے یہ نظام انسانوں کے خود ساختہ نظاموں پر غالب آجائے گا، خواہ وہ مذہب پرست طبقہ کے مسالک ہوں اور خواہ لامذہب اقوام کے نظام۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، میری زندگی کا مشن بھی دین کا احیاء رہا ہے۔ میری سوچ کا رخ کچھ اس طرف جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے کہ وہ دین سے روگردانی کرنے والی قوم کی جگہ دوسری قوم لے آئے گا تو اس سے بالضرور ایسی قوم مقصود نہیں جو کسی دوسرے ملک سے اٹھے یا کسی دوسری نسل سے متعلق ہو۔ اصل سوال ملک اور نسب کا نہیں، ذہنیت کا ہے۔ اگر کسی مذہب پرست قوم کی اگلی نسل زمانے کے تقاضوں سے مذہب سے برگشتہ ہو جائے اور اس کی تعلیم و تربیت قرآنی خطوط پر کر دی جائے تو یہ بھی وہ قوم ہو سکتی ہے جو مذہب کی جگہ دین کا نظام قائم کرے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی اپنی توجہات کو "شاہین بچوں" پر مرکوز کر رکھا تھا اور میں نے بھی اپنے پیغام کا اولین مخاطب اپنی قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو قرار دے رکھا ہے۔ اس میں مجھے بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے اور میں اس پروگرام کے مستقبل کے متعلق پرامید بھی ہوں۔ اس وقت تک میں تنہا اس آواز کو بلند کرتا چلا آرہا ہوں۔ اگر اس نہج پر سوچنے والے ارباب ہمت اجتماعی طور پر اس پروگرام پر عمل پیرا ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس میں کامیابی نہ ہو۔ مذہب تو زمانے کے تقاضوں کی تاب نہ لا کر مٹتا چلا جا رہا ہے۔ اسے ریت کے قصر خود بخود بہہ رہے ہیں۔ اگر دین کی وضاحت کر کے اسے صحیح رنگ میں پیش کر دیا جائے تو مادی دنیا سے مایوس اور متجسس انسان لپک کر اس کی طرف آجائے گا۔

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک

(جسے معلوماتِ عامہ کے لئے وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا ہے۔)

(۱) تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنے رہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

(۲) خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے ابد تک ضابطۂ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآنِ کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتمآب خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

(۳) قرآنِ کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جہاں تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابعِ تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

(۴) نبی اکرم کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمتِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے۔ سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورؐ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرتِ مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہیئے۔

(۵) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانینِ خداوندی کی اطاعت ایک نظامِ مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظامِ زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہو سکتا۔

(۶) رسول اللہؐ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآنِ کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

(۷) رسول اللہؐ کے بعد دین کا وہی نظام حضورؐ کے خلفائے راشدین نے جاری رکھا۔ اس میں امورِ مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآنِ کریم نے

صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر اُمّت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔

(۸) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے اُمّت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن اب مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

(۹) ہمارے لئے کام کرنے کا یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو اُمّت کو احکام قوانینِ خداوندی کے مطابق چلائے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانینِ خداوندی کے تابع ہو گی۔

(۱۰) چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہو گا۔ اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہو گا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کیلئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہمدگر مدغم ہو جائیں گے۔

(۱۱) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا، اُمّت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز، روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردّ و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اُسے "خدا اور رسول" کا طریقہ قرار دے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی، روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

(۱۳) قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

(۱۴) جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآنِ کریم کے مطابق ہو، یا جس سے حضور نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

(۱۵) ہم، رسول اللہؐ کے بعد، ہر قسم کے مدعیٔ وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

(۱۶) طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقے سے (اسے فرقہ اہلِ قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)۔ نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ اُمّت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز، روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں، ہم ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کرتے۔ اور بلا ردّ و بدل ان کی پابندی کرتے ہیں۔ ہم قرآنِ کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کا قیام عمل میں آ سکے۔ یہ ہے ہمارا مسلک، جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ مخالفین کا گمراہ کن پروپیگنڈا ہے۔

——— (○) ———

باسمہ تعالیٰ

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

آزادی کا قرآنی مفہوم

یومِ آزادی۔ اگست ۱۹۷۹ء پر خطاب

پرویزؔ

آزادی کا قرآنی مفہوم

غیر منقسم ہندوستان میں کانگریس (یعنی ہندو) بار بار (تحریکِ پاکستان کے سربراہ) قائداعظمؒ سے کہتے تھے کہ جب ہمارا مقصد بھی حصولِ آزادی ہے اور آپ کا مقصد بھی وہی تو آپ کو ایک الگ تنظیم قائم کرنے اور جداگانہ تحریک چلانے کی ضرورت کیا ہے؟ آپ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیے۔ ہم دونوں مل کر، انگریز کو یہاں سے نکال کر آزادی حاصل کر لیں گے اور نظامِ جمہوریت کی رو سے عوام کی حکومت قائم کریں گے جس میں تمام باشندگانِ ملک کو یکساں آزادی حاصل ہوگی۔ اس کے جواب میں (پہلے علامہ اقبالؒ اور ان کے بعد) قائداعظمؒ ان سے کہتے تھے کہ لفظی طور پر تو آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن جہاں تک لفظ آزادی کے مفہوم کا تعلق ہے، وہ آپ کے اور ہمارے نزدیک ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ آپ کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ انگریز یہاں سے چلا جائے اور اہلِ ہند اپنی حکومت آپ قائم کر لیں۔ لیکن ہمارے نزدیک آزادی کا مفہوم و مقصود اس سے مختلف ہے۔ اور وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جب تک مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت قائم نہ ہو جائے۔ (بالفاظ دیگر) وہ ان سے کہتے تھے کہ تمہارے نزدیک "آزاد مملکت" کا قیام مقصود بالذات ہے اور ہمارے نزدیک آزاد مملکت اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے جو مسلمان کی زندگی کا منتہیٰ ہے۔

یہ تھا تحریکِ پاکستان کے دوران کانگریس اور مسلم لیگ۔ یا ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی کشمکش کا نقطۂ تصادم۔ مسلمانوں کے نزدیک آزادی کا مفہوم کیا ہے، اس کی وضاحت کے لئے وہاں طلوعِ اسلام کا وجود عمل میں آیا۔ اس نے اس فریضہ کو کس حسن و خوبی اور کامیابی کے ساتھ ادا کیا، اس پر اس کے اُس زمانے کے فائل شاہد ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد (بظاہر) اس کشمکش کو ختم ہو جانا چاہیئے تھا لیکن (یہ فطرت کی ستم ظریفی یا ہماری انتہائی بدنصیبی تھی کہ) یہاں پہنچنے کے بعد یہ کشمکش اور بھی شدت اختیار کر گئی۔ یعنی یہاں آزادی سے وہی مفہوم لے لیا گیا جسے تحریکِ پاکستان کے دوران ہند پیش کرتا تھا۔ یعنی مسلمانوں کی آزاد مملکت میں جمہوری نظام کا قیام۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں آئین کے سرنامہ پر خدا اور اسلام کے الفاظ چسپاں کرا دیئے گئے، اسی طرح جس طرح ہم اپنے خطوط کی پیشانی پر بسم اللہ یا (۷۸۶) لکھ دیتے ہیں خواہ اس کے نیچے خط میں شراب کی درآمد برآمد کی ہدایات ہی کیوں نہ درج ہوں۔

لہٰذا یہاں بھی طلوعِ اسلام نے یہ فریضہ اپنے ذمہ لیا کہ وہ بتائے کہ آزادی کا وہ مفہوم کیا تھا جس کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا تھا۔ اس مقصد کے لئے پرویزؔ صاحب گزشتہ تیس سال سے مسلسل مصروفِ جہاد ہیں۔ یوں تو طلوعِ اسلام کی کون سی اشاعت ہے جس میں بالواسطہ یا بلا واسطہ اس موضوع پر کچھ نہ کچھ نہ لکھا جاتا ہو، لیکن خاص تقاریب بالخصوص یومِ آزادی (۱۴؍اگست) کی تقریب پر اس میں پرویزؔ صاحب کے خصوصی مقالات یا خطابات اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔ ۱۹۷۷ء کے یومِ آزادی کی تقریب کے سلسلہ میں جب ہم نے گزشتہ تقاریب کے خطابات پر ایک نظر ڈالی تو ہم نے دیکھا کہ انہوں نے ۱۹۷۳ء میں جو خطاب ارشاد فرمایا تھا (اور جس کا عنوان تھا — "کیا ہم آزاد ہیں؟") وہ نہ صرف بڑا جامع اور واضح تھا بلکہ ایسا کہ وہ ملک کے موجودہ حالات میں بھی شمعِ قرآنی کا کام دے سکتا ہے۔ چنانچہ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس تقریب پر، ان کی نظرِ ثانی کے بعد اسی کو زیبِ اوراقِ طلوعِ اسلام کر دیا جائے۔

واضح رہے کہ پرویزؔ صاحب اپنے خطابات یا مقالات میں جو قرآنی حقائق پیش کرتے ہیں وہ کبھی پرانے یا (OUT OF DATE) نہیں ہوتے۔ البتہ ان کی تشریحات اور جزئیات، حالات کے بدلنے سے محتاجِ تغیر و تبدل ہو جاتی ہیں۔ یہی ان کی نظرِ ثانی سے مقصود ہوتا ہے۔

اس تمہید کے بعد ان کا خطاب ملاحظہ فرمائیے۔

عزیزانِ گرامی قدر۔ سلام و رحمت

اگست ۱۹۴۸ء میں جب ہم نے اپنی آزادی کی پہلی سالگرہ منائی تو اس موضوع پر جو کچھ طلوعِ اسلام میں لکھا گیا تھا وہ آج بھی ہر سوچنے والے ذہن کو اسی طرح دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ:۔

انسانی تاریخ کے اوراق پیچھے کو الٹتے جائیے۔ کاغذ سے دھاتوں اور دھاتوں سے پتھروں، محلات سے جھونپڑیوں اور جھونپڑیوں سے غاروں تک کے از منۂ مظلمہ میں پہنچ جائیے۔ اس کی تہذیب کے نقشے بدلتے اور اس کے تمدن کے خاکے مختلف ہوتے چلے جائیں گے۔ زبانیں بدلیں گی، خیالات بدلیں گے۔ طرزِ بود و ماند بدلے گا۔ اسلوب رفتار و گفتار بدلے گا لیکن اعصار و دہور کے اس تضاد و تباین اور امصار و دیار کے اس اختلاف و تنوع میں ایک شے ہر جگہ اور ہر مقام پر مشترک اور غیر متبدل نظر آئے گی اور وہ یہ کہ انسانی شعور نے جب سے آنکھ کھولی ہے اس نے ہمیشہ آزادی کی حمد و ستائش میں الوہیتی نغمے گائے ہیں۔ اس نے مختلف زمانوں میں مختلف خداؤں کو چھوڑا اور مختلف دیوتاؤں کو پوجا ہے۔ لیکن اس نے آکاش کی اس دیوی کے حضور بلا تخصیصِ زمان و مکان ہمیشہ نذر و نیاز کے پھول چڑھائے اور عقیدت کی شمعیں جلائی ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں آپ کو خدا تک کے منکرین مل جائیں گے لیکن کسی دور میں ایسا گروہ نہیں ملے گا جس نے آزادی کی عظمت سے انکار کیا ہو۔ انسانی تاریخ کیا ہے؟ اپنی اپنی آزادی کے تحفظ کی جد و جہد کی مسلسل داستان۔ مختلف ادوار میں نمارید و فراعنۂ زمان اور اکاسرہ و قیاصرۂ دہر ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ کمزور اور ناتواں انسانوں کے سینے سے آزادی کی تمنا کو مٹا دیا جائے لیکن کمزور و ناتواں انسانوں نے

اپنا سب کچھ لٹا اور مٹا کر گوارا کر لیا مگر آزادی کی حسین آرزوؤں کو اپنے دل کے کاشانوں سے کبھی مٹنے نہیں دیا۔ انہوں نے اس قربان گاہ پر اپنی عزیز ترین متاعِ حیات تک کی بھینٹ چڑھا دی لیکن اس کی آن پر کبھی حرف نہیں آنے دیا۔ تاریخ کے ریگِ ساحل پر اَن گنت موجیں آئیں اور مختلف نقوش کو بہا کر اپنے ساتھ لے گئیں لیکن اگر کوئی نقش ایسا تھا جو اس کی مسلسل تگ و تاز کے باوجود کبھی مٹ نہ سکا تو وہ اس بطلِ جلیل کا نقش تھا جس نے آزادی کے تحفظ کی خاطر جان دے دی۔ یا پھر اس ننگِ انسانیت کا نام جس نے اپنوں کی آزادی کو دوسروں کے ہاتھوں بیچ دیا۔ بہرحال دنیا نے ہر قوم کی عظمت کو آزادی کے پیمانوں سے ناپا اور اسی کے معیاروں سے جانچا ہے۔ یہاں تک کہ آزادی کا لفظ دنیا کی ہر لغت میں شرف و مجدِ انسانیت کے مرادف اور غلامی، ذلت و خواری کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود کیا یہ امر باعثِ صد تعجب و موجبِ ہزار حیرت نہیں کہ آزادی کی خاطر سب کچھ کر گزرنے والا انسان آج تک یہ بھی متعین نہیں کر سکا کہ آزادی کہتے کسے ہیں؟ عوام کو تو چھوڑیئے۔ اس باب میں خواص تک کی یہ کیفیت ہے کہ وہ آزادی کی کوئی متعین (DEFINITION) بھی نہیں دے سکے۔ میرے سامنے اس وقت پولیٹیکل سائنس کی ایک کتاب ہے جو نہایت مختصر ہونے کے باوجود خاصی شہرت کی حامل ہے۔ یعنی (SOCIAL JUSTICE) یہ عصرِ حاضر کے ممتاز علمائے سیاست کے چیدہ چیدہ مقالات پر مشتمل ہے جنہیں پروفیسر (RICHARD B. BRANDT) نے ایڈیٹ کیا ہے۔ اس کے ایک مقالہ میں ہالبس، سپنسر، کانٹ، مل، ہارٹ، روسو، ہاپز، مارکس، انجلز، جیسے ممتاز مفکرین کی طرف سے پیش کردہ آزادی کی (DEFINITIONS) درج کی گئی ہیں اور اس کے بعد بدلائل و شواہد بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کوئی ڈیفینیشن بھی جامع اور واضح نہیں۔ ان تمام فکری اختلافات کے باوجود ایک بات البتہ ہر جگہ اور ہر مقام میں بطور قدرِ مشترک پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی قوم پر کوئی دوسری قوم حکمران ہو تو اسے غلامی کہا جاتا ہے اور اپنی حکومت کو آزادی۔ چنانچہ ہندوستان میں تحریکِ آزادی سے بھی یہی مفہوم لیا گیا تھا۔ وہ تحریک سامراج (یعنی غیروں کی حکومت) کے مقابلہ میں سوراجیہ (اپنی حکومت) کے لئے جدوجہد تھی۔

مسٹر (مہاتما) گاندھی نے مسلمانوں میں رائج اصطلاح ——— حکومتِ خداوندی ——— کے مقابلہ میں رام راجیہ کی اصطلاح وضع کی تھی لیکن وہ چل نہیں سکی تھی۔ وہاں آزادی کے لئے سوراج ہی کی اصطلاح رائج رہی۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ ایک

ہندوستان کی تحریکِ آزادی

غیر قوم یعنی انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر ان کی جگہ اپنی حکومت قائم کی جائے۔ یہی تحریکِ آزادی کا منتہیٰ و مقصود تھا۔ اس جدوجہد میں ہندوؤں کے علاوہ مسلمانوں کے بڑے بڑے سیاسی لیڈر اور مذہبی راہنما، مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ شامل تھے اور اس جدوجہد کو جہاد قرار دیتے تھے۔ یہ جدوجہد ایسی تھی جس کے مقصد و منتہیٰ (یعنی غیروں کی جگہ اپنی قوم کی حکومت کے قیام) کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس میں دو آراء ہو نہیں سکتیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب یہ جدوجہد پورے زوروں پر تھی تو اس کے خلاف ایک آواز بلند ہوئی جس نے نہایت واضح الفاظ میں کہا کہ آزادی کا یہ مفہوم ہندو کے نزدیک صحیح ہو سکتا ہے لیکن مسلمانوں کے نزدیک آزادی کا یہ مفہوم و مقصود درست قرار نہیں پا سکتا۔ ان کے نزدیک از روئے اسلام آزادی کا مفہوم اس سے مختلف ہے۔ تحریکِ آزادی کے علمبرداروں نے اس آواز کی سخت

مخالفت کی اور اس میں چونکہ یہ کہا گیا تھا کہ اسلام کی رُو سے آزادی کا مفہوم اس سے مختلف ہے اس لئے اس آواز کی مخالفت میں علماء حضرات بڑی شد و مد سے آگے بڑھے۔ انہوں نے مشہور یہ کیا کہ یہ آواز انگریز کے وضع کردہ ناقوس کی صدائے بازگشت ہے اور مقصد اس سے آزادی کی تحریک کے راستے میں روڑے اٹکانا۔ اس آواز کے بلند کرنے والے نے کہا کہ یہ الزام سراسر کذب ہے، افترا ہے۔ جہاں تک انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کا تعلق ہے مسلمان ہندوؤں سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔ لیکن جہاں انگریزوں کا یہاں سے نکل جانا، ہندوؤں کے نزدیک مقصود و منتہیٰ ہے، مسلمانوں کے نزدیک یہ اس جد و جہد کا منتہیٰ نہیں قرار پا سکتا۔ یہ ان کے پیشِ نظر مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ یا سنگِ میل قرار پا سکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی آواز

یہ آواز تھی حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی جنہوں نے مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے اعتراض کے جواب میں اپنے مفہوم کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی کہ:۔

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں۔ بلکہ ہمارا اولین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر اب ہے ایسا ہی رہے یا اس سے بدتر بن جائے، تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار بار لعنت بھیجتا ہے۔ میں ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا، سب حرام سمجھتا ہوں۔ قطعاً حرام۔

اس کے جواب میں کہا گیا کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد ہندوستان میں جمہوری نظام نافذ کیا جائے گا۔ جسے نہ صرف یہ کہ اس وقت دنیا کا بہترین نظامِ سیاست تسلیم کیا گیا ہے، بلکہ وہ عین مطابقِ اسلام ہے۔ اس لئے

جمہوریت

اقبالؒ کا اعتراض، اس کی قدامت پرستی، تنگ نظری اور تعصب پر مبنی ہے۔ اقبالؒ نے کہا کہ جس نظام کو تم بہترین نظام کہتے ہو، آزادی کے عام تصور کی رُو سے بھی اس کی حقیقت یہ ہے کہ:۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام	جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب	تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اور جہاں تک اس کے اسلامی ہونے کا تعلق ہے، سن رکھو کہ:۔

> جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
> جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

لہٰذا، اسلامی نقطۂ نگاہ سے مغرب کا جمہوری نظام ویسا ہی مردود و مطرود ہے جیسا نظامِ ملوکیت۔ اس نظام کے تحت آزادی کو ہم آزادی کہہ ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا، ہندو کی تحریکِ آزادی کے خلاف، مسلمان اسی طرح نبرد آزما رہیں گے جس طرح انگریز کی غلامی کے خلاف محاذ آرا ہیں۔ اس کے بعد جب تحریکِ آزادی کی زمامِ قیادت، قائدِ اعظمؒ نے اپنے ہاتھ میں لی تو وہ بھی مسلسل اور متواتر اقبالؒ کی پیش کردہ حقیقت کو دہراتے رہے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ

> ہم ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہمارا مذہب ایک دوسرے سے مختلف ہے بلکہ ہمارا کلچر بھی الگ ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات عطا کرتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ ہم اسی ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ مسلمان اس لئے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اس مملکت میں وہ اپنے ضابطۂ زندگی، اپنے ثقافتی نشوونما اور روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔ (تقاریر محمد علی جناح۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۳ و صفحہ ۴۶)

یہ تھا آزادی کے مفہوم کے متعلق ہمارا اختلاف جس کی بنا پر ہم نے انگریز اور ہندو دونوں کے خلاف محاذ قائم کیا تھا۔ ہماری یہ محاذ آرائی اس وقت تک جاری رہی جب تک ہم نے پاکستان حاصل نہ کر لیا۔

ہم نے آزادی کے اپنے منفرد مفہوم کے لئے پاکستان حاصل کر لیا لیکن اس کے بعد دنیا نے ایک عجیب تماشہ دیکھا کہ یہاں پہنچ کر ہم نے مغرب کے اس جمہوری نظام کو رائج کر لیا جسے اقبالؒ نے اسلام کے خلاف سازش قرار دیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے دو باتیں کہی تھیں۔ ایک یہ کہ مغرب کا جمہوری نظام، استبداد ملوکیت ہی کی ایک نقاب پوش شکل ہے۔ اس میں نوعِ انسان کبھی آزادی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ اور دوسرے یہ کہ یہ نظام، اسلام کی ضد ہے۔ اس لئے اس میں مسلمان کو وہ آزادی میسر نہیں آسکتی جو اسے اسلام عطا کرنا چاہتا ہے۔ میں آج کی نشست میں اقبالؒ کے ان ہر دو دعاوی کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا اپنی آزاد مملکت کے حصول کے بعد، مغرب کے جمہوری نظام میں ہمیں حقیقی آزادی نصیب ہو گئی ہے؛ اور دوسرے یہ کہ اس نظام کے متعلق خود مغرب کے اربابِ فکر و دانش اب کس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔

جمہوری نظام کے اساسی اصول

مغرب کے جمہوری نظام (ڈیماکریسی) کے بنیادی اصول حسبِ ذیل ہیں:-

۱- اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں اور ان کے اس اقتدار پر کسی اور کا کنٹرول نہیں۔ عوام کو اقتدارِ مطلق حاصل ہے۔ (DEMO-CRACY) کے معنی ہی عوام کی حکومت ہیں۔

۲- اس نظام میں عوام اپنے حاکم آپ ہوتے ہیں اس لئے حاکم اور محکوم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس میں یہ تفریق ہی مٹ جاتی ہے۔

۳- عوام اپنے اس اقتدار کو اپنے نمائندگان کے ذریعے بروئے کار لاتے ہیں۔

۴- ان نمائندگان کی اکثریت کے فیصلے یعنی وہ آئین یا قوانین جنہیں وہ وضع کر دیں، حرفِ آخر ہوتے ہیں جن کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی۔ البتہ یہ نمائندے اپنے فیصلوں کو جب بھی چاہیں خود بدل سکتے ہیں۔

۵- عوام کے یہ نمائندے دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ جو گروہ اکثریت میں ہوتا ہے وہ سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے۔ جو اقلیت میں رہ جاتا ہے اس کا مسلک اکثریت کی مخالفت کرنا اور ایسے حالات پیدا کرنا ہوتا ہے جن کی رو سے ان کی اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جائے اور اس طرح اقتدار ان سے چھن کر ان کے ہاتھ میں آجائے۔

۶- برسرِ اقتدار (اکثریتی) پارٹی جو کچھ جی میں آئے کرے۔ اسے اس مدت سے پہلے جس کے لئے عوام نے انہیں اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا، خود عوام بھی برطرف نہیں کر سکتے بجز اس کے کہ وہ اکثریت میں نہ رہیں۔

مغرب کے ارباب فکر و نظر اس نظام کے عملی تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ نظام ایسے مفروضوں پر مبنی ہے جن کا یا تو وجود ہی کوئی نہیں اور یا، جو یکسر باطل ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم ان ارباب علم و دانش کے نتائج فکر کو سامنے لائیں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ مغرب نے اس نظام کو وضع اور اختیار کن حالات میں کیا تھا۔

یورپ کا انقلاب

اقوام یورپ استبداد کی چکی کے دو پاٹوں میں بری طرح پس رہی تھیں۔ یعنی ملوکیت کی قہرمانی اور ارباب کلیسا کی تھیا کریسی ـــــ تھیا کریسی کا نظریہ سینٹ پال کا وضع کردہ ہے جس نے کہا تھا کہ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے لیکن اس نے اپنا یہ حق کلیسا (پادریوں) کو تفویض کر دیا ہے اب یہ خدا کے نام پر حکومت کریں۔ جب کلیسا اور رومن شہنشاہیت میں گٹھ جوڑ ہوا تو یہی اختیارات خداوندی شہنشاہوں کی طرف منتقل ہو گئے۔ لیکن ان پر کنٹرول کلیسا ہی کا رہا۔ لوتھر نے اپنی اصلاحی تحریک سے کلیسا کے فولادی شکنجے کو یہ کہہ کر توڑ ڈالا کہ انجیل کے سمجھنے کا حق ہر فرد کو حاصل ہے نہ کہ صرف چرچ کو۔ لیکن اس سے نظامِ حکومت کا مسئلہ حل نہ ہو سکا کیونکہ انجیل میں حکومت اور سیاست کے متعلق کوئی قانون ہی نہیں دیا گیا۔ لہٰذا حکومت کا استبداد بدستور قائم رہا۔ اس صورت حالات سے تنگ آ کر فرانس میں ایک انقلاب برپا ہوا جس کا نتیجہ روسو کا نظریہ حکومت تھا۔ اس نظریہ کی رو سے کہا یہ گیا کہ حق اقتدار نہ بادشاہوں کو حاصل ہے نہ کلیسا کے خدائی نمائندوں کو۔ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں۔ یہاں نظامِ جمہوریت کا ابتدائی تصور سامنے آیا اگرچہ اس کا اساسی تصور مفکرین یونان نے بہت پہلے پیش کیا تھا۔ ملوکیت اور کلیسا کے استبداد کی چکی میں پسنے والی انسانیت نے اس نظریہ کو نجات دہندہ سمجھ کر نہایت جوش و خروش اور مسرت و انبساط سے اس کا خیر مقدم کیا اور اسے نوع انسان کے لئے آیۂ رحمت سمجھا۔ ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ نظریہ جمہوریت (تھیا کریسی) کے سامنے آنے پر یہ جوش و مسرت، درحقیقت استبداد ملوکیت اور قہرمانی مذہبی پیشوائیت سے حصولِ نجات پر منفیانہ ردِّ عمل تھا۔ نظام جمہوریت کی کامیابی پر مثبت اظہار تشکر نہیں تھا۔ اس نظام پر تو ابھی تجربہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے عملی تجربہ کے بعد مفکرین مغرب جس نتیجہ پر پہنچے ہیں، اس ضمن میں میں اپنی کتاب "انسان نے کیا سوچا" کے ایک باب میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ مزید تصریحات اب پیشِ خدمت ہیں۔ مفکرین مغرب کے عملی تجربہ کا ملخص کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر (EWING) کے الفاظ میں یہ ہے کہ

> اگر روسو عصرِ حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب لکھتا تو وہ نظام جمہوریت کے متعلق کبھی ایسی خوش فہمی سے کام نہ لیتا (تمام حوالے خطاب کے آخر میں ملیں گے۔) ①

اس نظام کی بنیاد اس مفروضہ پر رکھی گئی تھی کہ اس میں لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کرتے ہیں اور اس طرح حاکم اور محکوم کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن فرانسیسی مفکر رینی گوئن اس باب میں لکھتا ہے کہ :-

> اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہوگا جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی تھی اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ اس میں جو لوگ برسرِ اقتدار آ جاتے ہیں، ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دل میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں وہ اپنے حاکم آپ ہیں۔ یعنی حکومت عوام کی ہے۔ ②

شکاگو یونیورسٹی کا فلسفہ کا پروفیسر (ALAN GEWIRTH) حقیقت کی نقاب کشائی ان الفاظ میں کرتا ہے :-

اس نظام میں پبلک یا قوم کے الفاظ ایک افسانہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس میں درحقیقت محض مؤثر پارٹیاں اپنا وجود رکھتی ہیں جو ایک دوسرے سے متصادم ہوتی رہتی ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو نظریۂ جمہوریت چرب زبان خطابت کا پیدا کردہ افترا ہوتا ہے جس میں صداقت، نیکی اور حسنِ عمل کے الفاظ کے حربے ہوتے ہیں جن کے ساتھ یہ گروہ میدانِ کارزار یا مارکٹ میں سامنے آتے رہتے ہیں۔ (۳)

اس نظریہ کا دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ اس میں حکومت، عوام کی رضامندی سے قائم ہوتی ہے اور جو حکومت کسی کی رضامندی سے قائم ہو اس کی فرماں پذیری اس پر لازم آجاتی ہے۔ لہٰذا جمہوری نظام میں برسرِاقتدار گروہ کی حکمرانی استبداد نہیں ہوتا، عوام کی بطیبِ خاطر رضامندی پر مبنی نظامِ اطاعت ہوتا ہے۔ پروفیسر (GEWIRTH) اس باب میں لکھتا ہے کہ (یہ مفروضہ بھی محض افسانہ ہے) "اس نظام میں لوگ اس حکومت کی اطاعت پر مجبور ہوتے ہیں جو اکثریت کی قائم کردہ ہوتی ہے۔ جس اقلیت نے ان نمائندوں کے خلاف ووٹ دیئے تھے یا جنہوں نے سرے سے ووٹ ہی نہیں دیئے تھے۔ اُن کی اطاعت کو بطیبِ خاطر اطاعت کیسے قرار دیا جا سکتا ہے"۔ (۴)

جمہوری نظام میں، روسو کے مفروضہ کے مطابق، حقِ اقتدار عوام کی مرضی کو حاصل ہوتا ہے اور یہ اقتدار بلاحدود و قیود ہوتا ہے۔ فرانسیسی مفکّر (BERTRAND DE JOUVENEL) نے (SOVEREIGNTY) کے نام سے ایک بڑی عمدہ کتاب لکھی ہے۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے:-

براۓ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اگر ایک دفعہ آپ اس اصول کو تسلیم کر لیں کہ انسانی مرضی اور ارادے (HUMAN WILL) کو اقتدارِ مطلق حاصل ہو سکتا ہے تو اس کے بعد جو نظام ہائے حکومت بھی قائم ہوں گے حقیقت کے اعتبار سے وہ سب ایک جیسے ہوں گے۔ نظامِ ملوکیت اور جمہوری نظام بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس اصول کی رو سے دونوں کا شعوری قالب ایک ہی ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو، یہ اصول اسے یکساں حقِ مطلق العنانی عطا کر دیتا ہے (صـ ۱۹۹)

اس مفکّر کی اس تحقیق کے بعد اقبالؒ کا وہ شعر پھر سامنے لائیے جو اس نے اس سے بہت پہلے کہا تھا اور جسے میں شروع میں پیشِ خدمت کر چکا ہوں کہ ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

آپ نے دیکھا کہ جس شخص کی بصیرت شمعِ قرآنی سے کسبِ ضیا کرتی ہو وہ کس قدر جلد حقائق کو بے نقاب دیکھ لیتا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے ——— کہ خارے دیدہ و احوالِ چمن گفت۔ اور اسی بنا پر وہ حتم و یقین کے ساتھ (لیکن بغیر کسی "دعویٰ" کے) کہہ سکتا ہے کہ ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے — عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

پروفیسر ہینڈ نے کہا تھا کہ انسانی ارادے کو مطلق اقتدار کا حق سونپنے کا نتیجہ استبداد اور مطلق العنانی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا، خواہ نظام کوئی سا بھی کیوں نہ ہو۔ اس سے مغربی مفکّرین کے سامنے یہ اہم سوال آیا کہ اگر انسانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہو سکتا تو پھر حقِ مطلق کسے حاصل ہو سکتا ہے؟ وہ لوگ اپنی مدت العمر کے فکری تجسّس کے بعد اس باب میں جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ انتہائی غور و تعمق کا متقاضی ہے۔ ان اربابِ فکر کا کہنا ہے کہ نظامِ حکومت مقصود بالذات نہیں۔ یہ ایک

عدل سے مراد

بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ بلند مقصد ہے قیامِ عدل۔ اس کے بعد عدل کے متعلق ان کی تصریحات اور تقاضے ملاحظہ فرمائیے۔ مشیگن یونیورسٹی کا فلسفہ کا پروفیسر (WILLIAM K. FRANKENA) لکھتا ہے کہ :-

> عدل، قوانینِ مملکت کے مطابق فیصلوں کو کہا جاتا ہے۔ قانون کی اصطلاح میں تو ایسا کہنا درست ہو سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود مملکت کے قوانین ہی عدل پر مبنی نہ ہوں تو ان کے مطابق عملی اقدامات کو آپ سوشل جسٹس کس طرح کہہ سکیں گے۔ ۵

اس سے یہ اہم سوال پیدا ہوا کہ اگر مملکت کے قوانین بہر حال مبنی بر حق و صداقت قرار نہیں پا سکتے تو پھر حق و باطل اور (JUST AND UNJUST) کا معیار کیا ہوگا۔ اس سوال کے جواب میں وہ پروفیسر (LEWIS) کے الفاظ میں لکھتا ہے کہ :-

> حق اسے کہیں گے جو تمام حالات میں حق ہو اور ہر فرد کے لئے یکساں طور پر حق ہو۔ عالمگیریت حق کی بنیادی شرط ہے۔ ۶

نہ صرف عالمگیریت بلکہ ابدیت بھی —— یعنی اسے ہر زمانے میں حق ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں وہ ٹینی سن کا یہ شعر نقل کرتا ہے کہ۔

> نیکی، صداقت یا پاکیزگی اور عدل، ان سے ابدیت کی کشش نکال دیجئے تو یہ سب راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جائیں گے۔

اس کے بعد وہ (EMIL BRUNNER) کا یہ قول درج کرتا ہے کہ :-

> جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل اور فلاں، ظلم پر مبنی ہے وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق الوہیاتی معیار موجود ہے، ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ تسلیم۔ عدل کے لفظ کا مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حق مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی، اور یا پھر بھوٹے نگوں کی مینا کاری اور خالی برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ ہوگی۔ ۷

ابدی اور غیر متبدل قانون

آکسفورڈ اور کیمبرج کے ایک ممتاز صاحبِ علم (ERNEST BARKER) نے سیاست مدن سے متعلق ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے۔ (PRINCIPLES OF SOCIAL AND POLITICAL THEORY) وہ اس میں لکھتا ہے :-

> اس مقام پر ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ کیا مملکت کے آئینی قانون کے شانہ بشانہ کوئی ایسا قانون بھی موجود ہے جو حقیقی اقدار پر مبنی ہے . . . . وہ قانون جسے ہم "فطری" کہہ سکیں کیونکہ وہ اشیاء کی کائنات کی فطرت، یا خود انسانی فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ قانون جو اس الحق پر مبنی ہوتا ہے جو اپنی ذات میں حق ہوتا ہے۔ جو اس عدل پر مبنی ہوتا ہے جو ہر جگہ اور ہر زمانے میں عدل ہوتا ہے۔ جو ان اقدار پر مبنی ہوتا ہے جو

اپنی قیمت آپ ہوتی ہیں خواہ انہیں آئینی حیثیت حاصل ہو یا نہ - یہ سوال آج کا پیدا شدہ نہیں - یہ (SOPHOCLES) اور ارسطو کے زمانے میں بھی موجود تھا - ارسطو نے اس قانون میں جسے کوئی قوم خود وضع کر کے اپنے لئے اختیار کرے اور اس میں جو تمام نوعِ انسان کے لئے عالمگیر ہو، تفریق کرتے ہوئے کہا تھا کہ موخرالذکر قانون، قانونِ فطرت ہے ..... وہ قانون جو اُس وقت بھی موجود ہوتا ہے جب نہ کسی قوم کا وجود ہو اور نہ کسی ایسے معاہدہ کا وجود جو مختلف افراد کو ایک رشتے میں منسلک کر دے - اس کی تائید میں ارسطو نے سوفوکلس کا یہ شعر درج کیا ہے کہ :-

اس قانون کی قوت، امروز و فردا کی پابند نہیں ہوتی - وہ ایک دائمی چشمہ سے پھوٹتا ہے جس کے منبع کا کسی انسان کو علم نہیں - (صفحہ ۹)

اس کے بعد وہ (BLACKSTONE) کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ :-

قانونِ فطرت کی اطاعت دنیا کی ہر اطاعت پر مقدم ہے - انسانوں کا وضع کردہ کوئی قانون جو اس قانونِ فطرت کے خلاف ہو کبھی جائز قرار نہیں پا سکتا - (صفحہ ۱۱)

امریکی پروفیسر (EDWARD CORWIN) نے جو کانسٹی ٹیوشن اور اس کی تاریخ پر اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے ایک نہایت مختصر لیکن بڑی پُر مغز کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (THE HIGHER LAW)- اس کی بحث و تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ انسانوں کے وضع کردہ آئین کی بنیاد اُن اصول و اقدار پر ہونی چاہیئے جو انسانوں کی وضع کردہ نہ ہوں اور زمان و مکان کی حدود سے ناآشنا ہوں - وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ "یہ نظریہ کہ مملکت کے آئین کو اس لئے بالادستی (SUPREMACY) حاصل ہے کہ اس کی جڑیں عوام کے ارادے (پاپولر ول) کی پیدا کردہ ہیں، امریکن آئین میں بعد کا پیدا شدہ ہے - ابتدا میں آئین کی فوقیت کا بنیادی معیار غیر متبدل اور لاابدی عدل کا تصور تھا اور انسانی ارادہ کو اس میں نسبتاً بہت کم دخل تھا یہ نظریہ موجودہ قانون کی ضد تھا - اس میں اس حیثیت کو تسلیم کیا گیا تھا کہ کائنات میں حق و صداقت اور عدل کے ایسے اصول موجود ہیں جنہیں اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ذاتی قدر و قیمت کی بنا پر باقی اصولوں پر غالب رہیں، اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ قوم کے برسرِاقتدار طبقہ کا اس باب میں کیا طرزِ عمل ہے - ان اصولوں کو کسی انسانی ہاتھ نے نہیں بنایا - یہ اصول اگر خود خدا سے قدیم نہیں تو اتنا ضرور ہے کہ ان کی رو سے خدا کا ایسا تصور سامنے آتا ہے جو انہیں کنٹرول کرتا اور با ہمدگر مربوط رکھتا ہے - یہ اصول موجود فی الخارج ..... اور ازلی ابدی اور غیر متبدل ہیں" (صفحہ ۴)

اس کے بعد کارون مشہور مقنن (CICERO) کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے :-

حقیقی قانون، مبنی بر حکمت اور فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے - یہ فضا میں ہر جگہ پھیلا ہوا، غیر متبدل اور ابدی ہوتا ہے - یہ قانون معروف کا حکم دیتا ہے، منکر سے روکتا ہے - یہ مملکت کا مقدس فریضہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کرے جو اس قانون کے خلاف ہو - اسے اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اس میں کسی قسم کی ترمیم کرے - نہ ہی وہ اُسے منسوخ کر سکتی ہے - نہ ہماری پارلیمان اور نہ ہی سینٹ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اس قانون کی اطاعت سے آزاد کر دے ..... نہ ہی اس قانون کی یہ کیفیت ہے کہ روما کے لئے الگ قانون ہو اور ایتھنز کے لئے الگ - ایک قانون آج ہو اور دوسرا کل - یہ ایک ازلی،

غیر متبدل قانون ہے جو اپنی طور پر تمام اقوام کو اپنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے۔ (ص ۱۱)

اس کے بعد وہ (CICERO) کے یہ ناقابلِ فراموش الفاظ درج کرتا ہے کہ

سچا قانون وہ ہے جو فطرت کے عطا کردہ معیار کے مطابق حق اور باطل میں امتیاز کرے۔ اس کے سوا کوئی قانون بھی ہو اسے نہ صرف یہ کہ قانون سمجھنا نہیں چاہیئے۔ اسے قانون کہنا ہی نہیں چاہیئے۔ (ص ۱۲)

نہ صرف یہ کہ "ایسے قانون کو قانون سمجھنا اور کہنا نہیں چاہیئے" (BARKER) کہتا ہے کہ ایسے قانون کی اطاعت ہی نہیں کرنی چاہیئے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :-

مملکت کے ساتھ میری وفاشعاری (LOYALTY) ان اقدار کے تابع ہے جن کے تحفظ کے لئے مملکت کا وجود عمل میں آیا ہے۔ اگر یہ مملکت ان اقدار کی وفاشعار نہیں رہتی تو ان اقدار کے تقاضے کی رو سے میں مجبور ہو جاتا ہوں کہ اپنی وفاداری کو عدمِ وفاداری میں بدل دوں اور اس طرح ایک خوشگوار فرماں پذیری کے بجائے بادلِ ناخواستہ مزاحمت کی روش اختیار کر لوں۔ (ص ۱۶۵)

حقیقت یہ ہے کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ مملکت ایسے معاہدہ کا بنیادی حق رکھتی ہے جس کی رو سے ہم پر اس کی اطاعت بہرحال واجب ہو۔ اس کے بجائے امرِ واقعہ یہ ہے کہ مملکت عدل کی مظہر اور اسے عمل میں لانے کا ذریعہ ہے۔ ہم پر مملکت کے اربابِ اختیارات کے احکامات کی پابندی اس لئے لازم ہوتی ہے کہ مملکت عدل قائم کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر مملکت ایسی نہیں رہتی تو اس کے ساتھ ہماری وفاشعاری اور اطاعت ختم ہو جاتی ہے (ص ۱۹۳)

آگے چل کر وہ کہتا ہے :-

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اطاعت کا وجوب مشروط ہوتا ہے مطلق نہیں ہوتا۔ یہ اطاعت ہر حالت میں واجب نہیں ہوتی۔ یہ اس وقت تک واجب ہوتی ہے جب تک یہ حق کے کسی بلند تقاضا کے ساتھ ٹکرائے نہیں۔ (ص ۲۲)

آپ نے غور فرمایا عزیزانِ من! کہ نظامِ جمہوریت کے تلخ نتائج کا ستایا ہوا انسان اب کس قسم کے قانون کی تلاش میں ہے۔ ایک ازلی و ابدی، عالمگیر قانون جس کا سرچشمہ انسانی فکر سے بلند اور ماوراء ہو!

اس کے بعد مغرب کا یہ مفکر بصد حرمان و یاس، ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا ہے کہ جمہوری نظام کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے متلاشیانِ حقیقت کی مشکل یہ تھی کہ اس قسم کے قوانینِ فطرت کا ضابطہ کہیں موجود نہ تھا۔

(BARKER . P. 100)

مفکرینِ مغرب کی دشواری

انسانوں کے خود ساختہ قوانین و ضوابط کا ستایا ہوا انسان آج بھی اپنے آپ کو اسی مقام پر پاتا ہے جہاں اس زمانے کا انسان تھا جس نے ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے استبداد سے نجات کی راہ نظامِ جمہوریت میں سمجھی تھی۔ اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ جسے چشمۂ حیات سمجھ کر اس کی طرف لپکا تھا وہ سراب ثابت ہوا۔ اور چشمۂ حیات کا اب بھی اسے کوئی سراغ نہیں مل رہا اگرچہ اس کی تلاش میں وہ اس قدر سرگرداں و حیراں اور مضطرب و بیتاب ہے۔ ان کی فکر نے انہیں اتنا تو بتا دیا ہے کہ وہ ضابطہ قوانین

جس میں انسانیت کی نجات کا راز مضمر ہے، کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ وہ ازلی ابدی، زمان و مکان سے ماوراء عالمگیر ہونا چاہیئے۔ وہ اس نتیجہ پر بھی پہنچ چکے ہیں۔ کہ ایسا قانون انسانوں کا خود ساختہ نہیں ہو سکتا۔ انسانی فکر ایسا ضابطہ قوانین وضع ہی نہیں کر سکتی۔ اس کا سرچشمہ انسانی فکر سے ماوراء ہونا چاہیئے۔ وہ یہاں تک تو پہنچ گئے ہیں۔ لیکن وہ اُسے منزل من اللہ یا وحی کہہ کر نہیں پکارتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ہم نے اُسے قانونِ خداوندی کہہ دیا تو پادری یہ کہتے ہوئے بھاگے بھاگے آجائیں گے کہ جس قانونِ خداوندی کے تم متلاشی ہو وہ قانون ہم دے سکتے ہیں کیونکہ ہم خدا کے نمائندے ہیں۔ اس سے ان پر تھیا کریسی کا وہی استبداد پھر مسلط ہو جائے گا جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے انہوں نے نظامِ جمہوریت وضع اور اختیار کیا تھا۔ اس ڈر سے وہ اپنے مطلوبہ ضابطۂ قوانین کو قانونِ فطرت یا فطرتِ انسانی میں مضمر قانون جیسی مبہم اصطلاحات سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی دوسری مشکل یہ ہے کہ انہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ قانون ملے گا کہاں سے؟ فکرِ مغرب کی یہی بے کلی اور بے تابی اور دوسری طرف بے بسی اور بے چارگی تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ:-

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار   عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا

اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا   زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

مسلمانوں کی حالت

مغربی اقوام کی بے بسی کا تو یہ عالم ہے لیکن مسلمان کی حالت ان سے بھی عجیب تر ہے۔ صدیوں کی غلامی اور محکومی نے ان کی فکری صلاحیتوں ہی کو سلب کر دیا ہے۔ محکومیت اس لئے بدترین لعنت ہوتی ہے کہ اس میں اقبالؒ کے الفاظ میں ——— "جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر" ہوتے ہیں۔ محکوم اگر کسی وقت اپنے بدن کو (حاکم قوم) کے قبضہ سے چھڑا لیتا ہے تو بھی اس کی جان اس کے قبضے میں بدستور رہتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے اس کی آنکھ سے، سنتا ہے اس کے کانوں سے، سوچتا ہے اس کے دماغ سے۔ وہ قومِ غالب کے ہر نظریہ، مسلک یا نظام کو عرشِ معلیٰ سے نازل شدہ سمجھتا اور اس کی تقلید کو اپنے لئے موجبِ ہزار فخر و مباہات قرار دیتا ہے۔ اقوامِ غالب اپنی چھوڑی ہوئی ہڈیاں اس کی طرف پھینکتی ہیں اور یہ انہیں لپک کر اٹھاتا اور اپنے لئے خوانِ یغما سمجھتا ہے۔ حصولِ آزادی (تشکیلِ پاکستان) کے بعد جب ہمیں ایک نظام کی ضرورت پڑی تو ہم نے مغرب کے جمہوری نظام کو صحیفۂ آسمانی سمجھ کر تقدس کے ہاتھوں سے اٹھایا اور عقیدت کی آنکھوں کے ساتھ لگا کر اسے بکمالِ فخر و مباہات اپنے ہاں نافذ کر لیا۔ حالانکہ اس وقت یہ نظام خود اقوامِ مغرب کے ہاں ناکام تجربہ ثابت ہو رہا تھا اور، جیسا کہ میں نے ابھی بتایا ہے، وہاں کے مفکرین کسی دوسرے نظام کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ہمارے ہاں شروع میں تو اس نظام کی حیثیت سیاسی سی تھی لیکن جب مذہبی پیشوائیت کے سینے میں ہوسِ اقتدار نے انگڑائی لی تو ان کی طاقت کا سرچشمہ تقلید پرست عوام کی مذہب سے وابستگی کا جذبہ تھا۔ انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور "بحالیٔ جمہوریت" کی تحریک چلائی۔ اس طرح اس نظام کو جو سیکولر اقوام کے ہاں بھی مردود قرار پا چکا تھا، عین اسلامی کہہ کر عوام کو اپنے پیچھے لگا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ کہ اس آزادی کا حصول تو درکنار جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا، ہم مغرب کی شکست خوردہ

اقوام کے حاشیہ بردار (CAMP FOLLOWERS) بن کر رہ گئے۔

قرآنی نظام

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، جمہوری نظام کی اصل و اساس اس مفروضہ پر ہے کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں۔ انہی کو حقِ حکومت پہنچتا ہے اور ان کے نمائندوں کی اکثریت کو آئین و قانون سازی کا حق حاصل ہوتا ہے۔ قرآن سرے سے اس مفروضہ کو باطل قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنائے —— خواہ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کا کوئی گروہ (۳/۷۹) قرآن کریم کے اس اوّلین اصول کی رو سے ایک طرف مغربی نظامِ جمہوریت خلافِ اسلام قرار پا جاتا ہے اور دوسری طرف اس سے آزادی اور غلامی کا صحیح تصوّر سامنے آجاتا ہے۔ اس کی رو سے انسانوں کی حکومت خواہ وہ اپنی قوم کی ہو اور خواہ کسی دوسری قوم کی، بہرحال غلامی ہے۔ اس سے علامہ اقبالؒ کے اس جواب کی حقانیت نکھر کر سامنے آجاتی ہے جو انہوں نے (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کو دیا تھا اور جس میں کہا تھا کہ اگر انگریز ہندوستان سے چلا جائے اور اس کی جگہ اہلِ ہند کی اپنی حکومت قائم ہو جائے تو ہندو کے نزدیک بیشک یہ آزادی قرار پا جائے گی۔ لیکن مسلمان کے نزدیک، جو قرآن کا متبع ہے، یہ بدستور غلامی کی غلامی رہے گی اور ایک باطل نظام کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرے باطل نظام کا قیام۔

حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حقِ حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں تو پھر یہ حق کسے حاصل ہے۔ اس لئے کہ قرآن کا یہ منشاء تو ہو نہیں سکتا کہ انسانوں میں نظامِ حکومت سرے سے ہو ہی نہ۔ وہ انسانوں کی تمدنی زندگی کے لئے نظامِ حکومت ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) وہ اپنے اس حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶) بنابریں۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کی جائے۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (۱۲/۴۰) یہی محکم نظامِ حیات ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو سمجھتے نہیں اور وہ انسانی حکومتوں کی ہیئت (FORM) بدل کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادی حاصل کر لی ہے۔ ہیئت کے بدل دینے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔

لیکن اس سے وہ خدشہ سامنے آجاتا ہے جس سے مجروح ہو کر اہلِ مغرب نے نظامِ جمہوریت اختیار کیا تھا۔ وہاں مذہبی پیشوائیت نے یہی کہا تھا کہ حقِ حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں، خدا کو حاصل ہے، لیکن خدا اپنی حکومت اپنے نمائندگان کے ذریعے قائم کرتا ہے جنہیں وہ اپنے اختیارات تفویض کر دیتا ہے۔ ہم اس کے نمائندے ہیں، اس لئے ہماری حکومت انسانوں کی حکومت نہیں، خدا کی حکومت ہے۔ اس سے تھیاکریسی کا وہ نظامِ حکومت وجود میں آگیا جو ملوکیت سے بھی بدتر تھا۔ ملوکیت کے خلاف تو بغاوت بھی کی جا سکتی تھی جس کی نوعیت بہرحال سیاسی سمجھی جاتی تھی۔ خدا کے ان (مزعومہ) نمائندوں کے خلاف بغاوت، خود خدا کے خلاف بغاوت قرار پا جاتی تھی۔

اس کا عملی ذریعہ کتاب اللہ کی حاکمیت ہے

قرآن نے کہا کہ خدا کی حکومت، خدا کی کتاب (یعنی قرآن کریم) کے ذریعے قائم ہوگی جس میں کسی انسان کا کوئی دخل نہیں ہوگا، کیونکہ خدا اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کیا کرتا۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے خود زبانِ نبوی

سے کہلوایا گیا کہ اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا ۔ (۶/۱۱۴) "کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور حاکم کی طلب و جستجو کروں، حالانکہ اس نے اپنی کتاب نازل کر دی ہے جو مفصل ہے"۔ یہاں سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔ ایک یہ کہ تھیاکریسی اس لئے وجود میں آئی تھی کہ خدا کی کوئی ایسی کتاب موجود نہیں تھی جو ضابطۂ زندگی بن سکتی۔ اس لئے جب خدائی حکومت کا اصول تسلیم کر لیا جاتا تھا تو اس کے بعد لوگوں کو لازماً مذہبی پیشوائیت کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس حقیقت کا اعلان خود ذاتِ رسالت مآبؐ سے کرانے میں حکمت یہ تھی کہ دنیا میں اگر کوئی انسان خدا کا نمائندہ بن سکتا تھا تو اس کا اوّلین حق بہر حال رسول اللہ کو پہنچتا تھا جب حضورؐ نے بھی یہ فرما دیا کہ خدائی حکومت کے معنی اس کی کتاب کی حکومت ہے تو انسانی نمائندگی یا خدائی اختیارات کی تفویض کا نظریہ خود بخود باطل قرار دیا گیا۔ اس نظریہ کی رو سے حکومت، خدا کی کتاب کے احکام و قوانین نافذ کرنے کی ایجنسی قرار پا گئی۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ اس نظریہ کی صداقت کا تسلیم کر لینا ایمان قرار پایا اور اس سے انکار کفر۔ سورت مائدہ میں ہے:-

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ۝ (۵/۴۴)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی کافر ہیں۔

اور اس کے ساتھ ہی رسول اللہ سے فرما دیا گیا کہ — وَاَنِ احْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ ۔ (۵/۴۹) "ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو"۔ گویا یہاں پھر دہرا دیا کہ یہ حکومت تھیاکریسی نہیں ہوگی۔ یہ کتاب اللہ کی حکومت ہوگی۔ قرآن کریم نے خدا کے سوا ہر اقتدار کو طاغوت کہہ کر پکارا ہے، اور کفر اور ایمان کے اس فرق کو ان الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَھَا ۔۔۔۔ (۲/۲۵۶) "جو خدا پر ایمان لایا اور اس نے طاغوت سے کفر برتا تو اس نے ایسا محکم سررشتہ تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا"۔ اور اس "کفر بالطاغوت" کی تشریح ان الفاظ سے کر دی کہ "کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جو یہ تو خوش ہوتے ہیں کہ ہم کتاب اللہ پر ایمان لے آئے ہیں۔ لیکن عملاً ان کی حالت یہ ہے کہ وہ چاہتے یہ ہیں کہ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ (۴/۶۰) "اپنے معاملات کے فیصلے طاغوت سے کرائیں حالانکہ انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ طاغوت سے کفر برتیں"۔ یہاں سے بات بالکل واضح ہو گئی کہ خدا پر ایمان سے عملاً مفہوم یہ ہے کہ حکومت کے لئے اس کی کتاب کو اتھارٹی تسلیم کیا جائے۔ اگر اس کے سوا کوئی اور اتھارٹی تسلیم کر لی گئی تو یہ کفر ہوگا۔ اس کتاب کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اسے مفصل کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۔ (۶/۱۱۵) "خدا کے کلمات (قوانینِ خداوندی) صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ یہ قوانین غیر متبدل ہیں"۔ بالفاظ دیگر یہ ضابطۂ خداوندی مفصل، مکمل اور غیر متبدل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لئے محفوظ بھی۔ (۱۵/۹)۔

یہی وہ جس قسم کے ضابطۂ حیات کی مفکرینِ مغرب کو تلاش تھی لیکن وہ انہیں کہیں سے ملتا نہیں تھا، وہ سامنے آ گیا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مفکرینِ مغرب اپنے عقلی و تجرباتی طریق سے اس نتیجہ تک تو پہنچ گئے ہیں کہ اسی قسم کا ضابطہ اور نظام، انسانی مشکلات کا حل پیش کر سکتا ہے لیکن انہیں اس کا سراغ نہیں ملتا کہ وہ ضابطہ ملے گا کہاں سے؟ اگر ان کے سامنے قرآن اپنی حقیقی شکل میں آ جائے تو وہ یقیناً اسے لپک کر اٹھا لیں۔ اس کے راستے میں رکاوٹ

کیا ہے اسے میں ذرا آگے چل کر بیان کروں گا۔ جو کچھ میں نے اس وقت تک کہا ہے اس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک خدا کی کتاب کے تابع زندگی بسر کرنا ہی آزادی ہے۔ اس میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حکومت کس کے ہاتھوں قائم ہوتی ہے۔ اگر حکومت خدا کی کتاب کی نہیں تو یہ آزادی نہیں، محکومی ہے، خواہ اس مملکت میں اقتدار خود اپنی قوم کے ہاتھوں میں ہی کیوں نہ ہو۔ انسانوں کو آزادی صرف کتاب اللہ کے تابع رہنے سے مل سکتی ہے۔ ارشاد ہے۔ لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ۔ "اہلِ کتاب ہوں یا مشرکین کے باشندے انہیں کبھی آزادی نصیب نہیں ہو سکتی تھی تاوقتیکہ ان کے پاس واضح حقیقت نہ آجاتی ـــــ یعنی اللہ کا رسول نہایت پاکیزہ صحائف لے کر ـــــ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ۔ (۹۸/۱-۳) وہ صحیفہ آسمانی جس میں نہایت محکم قوانین ہیں"۔ نوعِ انسان کو حقیقی آزادی اس کتاب کی اطاعت سے مل سکتی تھی۔ اسی سے انسانوں کی حکومت کی وہ زنجیریں ٹوٹ سکتی تھیں جن میں نوعِ انسان جکڑی چلی آرہی تھی اور اسی سے وہ بوجھل سلیں ان کے سر سے اتر سکتی تھیں جن کے بوجھ تلے وہ اس بُری طرح دبی ہوئی تھی۔ (۷/۱۵۷)

استخلاف فی الارض

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اسلام میں حکومت، قرآنی احکام و اقدار کے نفاذ کی ایجنسی ہے۔ بالفاظِ دیگر اسے قانون سازی کا اختیار نہیں ہوتا۔ اس کا منصب قوانینِ خداوندی کا نافذ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کی حیثیت صرف اجرائیہ یا انتظامیہ کی رہ جاتی ہے۔ قرآنی اصطلاح میں اسے "استخلاف فی الارض" کہا جاتا ہے۔ یہیں سے لفظ خلیفہ ہے۔ (ضمناً) یہ جو ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا تو یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ قرآن میں کہیں نہیں آیا کہ خدا نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ یہ عیسائیت کا تصور ہے جس کی رو سے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ خدا نے اپنے اختیارات اپنے نمائندوں (کلیسا) کو تفویض کر دیئے ہیں۔ اس نکتہ کی وضاحت پہلے بھی کی جا چکی ہے۔ اسی تصور سے متاثر تھا وہ ذہن جس نے ایک دفعہ حضرت صدیقِ اکبرؓ کو خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا تو آپ نے اُسے سختی سے روک دیا اور فرمایا کہ خدا کا خلیفہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں خلیفۃ الرسولؐ (یعنی رسول کا جانشین) ہوں۔ اور حضرت عمرؓ نے اس سے التباس کے امکان کو بھی ختم کرنے کے لئے خلیفہ کے بجائے امیر المؤمنین کا لقب اختیار فرمایا۔

بہرحال بات "استخلاف فی الارض" کی ہو رہی تھی جس سے مراد ہے وہ نظامِ حکومت جس کی رُو سے قرآنی احکام و اقدار کو نافذ کیا جائے۔ زمانہ قدیم میں جب ہنوز اقتدار کا مرکز شخصیتیں ہوتی تھیں اللہ تعالیٰ نے افراد کو خلیفہ کہہ کر پکارا۔ سورۂ صٓ میں حضرت داؤدؑ کے متعلق ہے۔ يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ۔ (۳۸/۲۶) "اے داؤد! ہم نے تمہیں ملک میں خلیفہ بنایا ہے سو تم لوگوں میں الحق (وحیِ خداوندی) کے مطابق حکومت قائم کرو"۔ لیکن جب نوعِ انسان اپنے بچپن کی منزلیں طے کر لینے کے بعد عالمِ شباب تک آپہنچی تو شخصیتوں کا دور ختم ہو گیا اور عالمگیر انسانیت کے لئے وحی کی راہنمائی میں اپنے معاملات آپ طے کرنے کا نیا دور شروع ہو گیا۔ تاریخ میں حضور رسالت مآبؐ اس دورِ بچپن کے اختتام اور عصرِ جدید کے آغاز کے نقطۂ اتصال پر فائز نظر آتے ہیں۔ ختمِ نبوت کا اعلان اسی انقلاب کی تمہید ہے۔ چنانچہ اس مقام پر پہنچ کر استخلاف فی الارض، اشخاص کے بجائے اُمتوں

کی طرف منتقل ہو گیا۔ کیا آپ نے اس پر کبھی غور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کے متعلق تو فرمایا کہ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ۔ لیکن حضور خاتم الانبیاءؐ کے زمانے میں کہا کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ (۲۴/۵۵)۔ "تم میں سے جو لوگ وحی کی ابدی صداقتوں کو تسلیم کریں گے اور ان کے اعمال اس پیمانے پر پورے اتریں گے تو انہیں استخلاف فی الارض عطا کیا جائے گا۔ یہ خدا کا وعدہ یعنی اس کا غیر متبدل قانون ہے"۔ یعنی اب استخلاف فی الارض اشخاص کے بجائے امتوں کے حصے میں آئے گا۔ سوچئے عزیزانِ من! کہ اس انقلابِ عظیم کا اعلان آج سے چودہ سو سال پہلے اس زمانے میں ہوا جب ساری دنیا میں شخصی حکومتوں کا دور دورہ تھا اور افراد کی جگہ امتوں کی حکومتوں کا تصور تک کسی کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ روسو کا فلسفہ اور انقلابِ فرانس تو ابھی کل کی بات ہے۔ قرآن کریم کے تجویز کردہ نظام کی رو سے استخلاف فی الارض، امتِ مسلمہ (یعنی امتِ محمدیہ) کے حصے میں آیا۔ اس امت سے کہہ دیا گیا کہ ان احکام و قوانین کی کارفرمائی کے لئے جو عملی پروگرام تجویز اور اختیار کیا جائے گا وہ بھی کسی ایک فرد کا طے کردہ نہیں ہو گا۔ وہ تمہارے باہمی مشورے سے طے ہو گا —— وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ۔ (۴۲/۳۸)۔ حتیٰ کہ اس نظام کے سربراہِ اوّل جو بہر حال رسول اللہ ہی ہو سکتے تھے سے بھی تاکید کر دی کہ وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (۳/۱۵۸) "مملکت کے معاملات طے کرنے کے لئے افرادِ امت سے مشورہ کیا کرو"۔ ان احکامات کی رُو سے، قرآن کریم نے ہر قسم کی شخصی حکومت —— ملوکیت یا آمریت —— اور ان کے ساتھ ہی تھیاکریسی کا خاتمہ کر دیا۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ استخلاف فی الارض یعنی نظامِ حکومت مقصود بالذات نہیں تھا، ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اور وہ بلند مقصد تھا، قرآنی اصول و اقدار اور احکام و قوانین کا نفاذ و اجراء۔ سورہ النور میں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ ایمان و اعمالِ صالحہ کے نتیجہ میں تمہیں استخلاف فی الارض، حاصل ہو گا، اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ یہ استخلاف اس لئے دیا جائے گا۔ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ۔ (۲۴/۵۵) "تاکہ اس سے اس دین کا تمکن ہو جائے (وہ نظامِ زندگی قائم اور (ESTABLISH) ہو جائے) جسے تمہارے لئے پسند کیا گیا ہے۔ مملکت کے اس فریضہ کو دیگر مقامات میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ان امور کا نافذ کرنا جنہیں قرآن کی سندِ قبولیت حاصل ہو، اور ان سے لوگوں کو روکنا جو اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں سورۃ حج میں ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۲/۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں تمکن حاصل ہو گا تو اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ان کا فریضہ ہو گا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ان کے تمکن کا مقصد۔ اس میں تمام معاملات انجام کار خدائی پروگرام کی تکمیل کے لئے سرانجام پائیں گے۔

پھر دیکھئے کہ چونکہ یہ تمکن فی الارض پوری کی پوری امت کو حاصل ہو گا نہ کہ کسی ایک فرد یا گروہ کو اس لئے "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کا فریضہ بھی پوری کی پوری امت کا ہو گا نہ کسی ایک گروہ کا۔ سورۃ آل عمران میں ہے۔ كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۱۰) "تم بہترین امت

ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔" یہی اس امت سے کہا گیا اور یہی اس نظام کے سربراہ اوّل حضور نبی اکرمؐ سے (۱۰۴/۳)

متعدد مقامات پر اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اس نظام میں امت حتیٰ کہ خود رسول اللہؐ کو بھی اس کا اختیار نہیں ہوگا کہ وہ خدا کی طرف سے عطا کردہ ضابطۂ حیات (قرآن کریم) میں کسی قسم کا ردّ و بدل کر سکیں۔ مخالفین کہتے کہ ہم اس نظام میں شریک ہونے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ آپ اس ضابطہ میں کچھ تبدیلیاں کر دیں۔ اس کے جواب میں حضورؐ فرماتے کہ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي۔ "یہ میرے حیطۂ اختیار ہی میں نہیں کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر دوں"۔ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ۔ "میں تو خود بھی اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے"۔ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ۔ (۱۰/۱۵) "اگر میں بھی اس کی نافرمانی کر دوں تو اس کی سزا سے نہیں بچ سکتا"۔

یہاں سے ایک اور اہم نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میں خود اسی ضابطۂ قوانین خداوندی کا اتباع کرتا ہوں۔ اگر میں بھی اس کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مواخذہ سے بچ نہیں سکتا۔ اس سے واضح ہے کہ اطاعت ضابطۂ خداوندی (قرآن کریم) ہی کی ہے۔ اسلامی نظامِ مملکت اس کی اطاعت کرانے کی مشینری وضع کرتا ہے۔

کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں

ان تصریحات کے بعد ہم اس ارشادِ خداوندی کو سامنے لاتے ہیں جو نظامِ حکومتِ اسلامی کی اساس و بنیاد اس موضوع پر حرفِ آخر اور تمام نوعِ انسانی کے لئے حقیقی آزادی کا منشور (CHARTER) ہے۔ اسے غور سے سنیئے۔ ارشاد ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ۔ (۳/۷۸)

کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا —— خواہ خدا اسے ضابطۂ قوانین یا حکومت یا نبوت بھی کیوں نہ عطا کر دے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم اس کتاب کی اطاعت کے ذریعے، جسے تم پڑھتے پڑھاتے اور سیکھتے سکھاتے ہو۔ اللہ کے محکوم (ربّانی) بن جاؤ۔

یہ آیۂ جلیلہ اسلامی نظامِ حکومت کا دستورِ اساسی یا نوعِ انسان کے لئے "آزادی کا چارٹر" ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ اطاعت یا محکومیت کسی انسان (یا انسانوں کے گروہ) کی جائز نہیں "خواہ وہ اطاعت انسانوں کے وضع کردہ ضابطۂ قوانین کی رو سے ہو (کتاب)، خواہ انتظامیہ کی ہو (حکم) حتیٰ کہ نبی کی بھی نہیں (نبوت)۔ اسلامی نظام میں اطاعت اور محکومیت، کتاب اللہ کی ہوگی۔ وہ نظام جس کی خصوصیت یہ ہوگی کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست — عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

یہی تھا وہ مقصد جس کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا تھا لیکن جو آج تک اس مقصد سے محروم ہے۔ یہاں ایک دن کے لئے بھی کتاب اللہ کی حکومت قائم نہیں ہوئی۔ لہٰذا، ہمیں وہ آزادی نصیب ہی نہیں ہوئی جس کی ضامن خدا کی یہ کتاب ہے اور جو وجہ شرفِ انسانیت ہے۔ قرآنی آزادی تو ایک طرف، یہاں تو مغرب کا نظامِ جمہوریت بھی اپنی حقیقی شکل میں

قائم نہیں ہو سکا۔ یہاں کسی نہ کسی رنگ میں آمریت ہی کا دور دورہ رہا جو غلامی کی بدترین صورت ہوتی ہے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت، آمریت کے خلاف تو اعلانِ جنگ کرتی ہے لیکن مغربی جمہوریت کو عین مطابقِ اسلام قرار دیتی ہے جس میں اکثریت کے فیصلوں کو برحق تسلیم کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں اقامتِ دین کے سب سے بڑے مدعی جماعتِ اسلامی کے بانی ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ہیں۔ وہ مطالبۂ پاکستان کی مخالفت میں ایک دلیل یہ بھی دیا کرتے تھے کہ:۔

> جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی۔ ان کا گمان غلط ہے۔ در اصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا۔ وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ ص ۱۳۱)

اکثریت کا نظام

پاکستان میں آکر انہوں نے (صدر ایوب کے دور کے انتخابات کے زمانے میں) اپنے اس مسلک کا اظہار فرمایا کہ:۔

> اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ اس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریہ کے مطابق ہونا چاہیئے۔ (امروز مورخہ ۲۰ اگست ۱۹۶۳ء)

اتنا ہی نہیں مودودی صاحب نے دین کے معاملے میں بھی اکثریت کے اصول کو حق کا معیار قرار دے دیا۔ انہوں نے کہا ہے کہ:۔

> اگر شریعت کو ملک کا دستور اور آئین بنانا ہے (جس سے کوئی مسلمان انکار کی جرأت نہیں کر سکتا) تو جمہوریت کے مسلّم قاعدہ[۱] کے مطابق یہاں شریعت کی وہی تعبیر دستور اور آئین کی شکل اختیار کرے گی جسے مسلمانوں کی عظیم اکثریت معتبر مانتی ہے اب یہ ظاہر ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت حنفی ہے ۔۔۔ لہٰذا اس کا قانون حنفی تعبیرِ شریعت پر مبنی ہوگا۔ (ترجمان القرآن۔ بابت جون ۔ جولائی ۱۹۵۲ء)

چنانچہ اب ملک میں حنفی فقہ پبلک لاز کی حیثیت سے نافذ کی جا رہی ہے۔ جیسا کہ میں متعدد بار واضح کر چکا ہوں میرا تعلق کسی مذہبی فرقے سے نہیں اس لئے میں نہ کسی فرقہ کی فقہ کے حق میں ہوں نہ کسی فرقہ کی فقہ کے خلاف۔ میں تو قرآن مجید کا طالب علم ہوں اور میرا فریضہ یہ ہے کہ ہر پیش آمدہ معاملے کے متعلق یہ واضح کر دوں کہ اس کی بابت قرآن مجید کا کیا فیصلہ ہے۔ قرآن مجید کی رو سے اکثریت یا اقلیت کے معیارِ حق و باطل قرار پانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ "اکثریت" کے متعلق تو وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے:۔

> وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ( )
>
> اگر تو دنیا کے باشندوں کی اکثریت کی اطاعت کرنے لگ جائے گا تو وہ تجھے اللہ کے راستے سے گمراہ کر دیں گے۔ وہ محض ظن و تخمین کا اتباع کرتے ہیں اور قیاس آرائیوں سے کام لیتے رہتے ہیں۔

اور تو اور خود مودودی صاحب بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:۔

> اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلے میں برحق ہو اور اگر ایسا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ

---

[۱] یعنی مغربی جمہوریت کا مسلّم قاعدہ دین میں حق و باطل کا معیار قرار دیا جا رہا ہے۔ (استغفر اللہ)

اس کی تائید میں ایک جسیم تفسیر نہیں۔ (اسلام کا نظریہ سیاسی - ص۴۴ - ۴۵)

لہٰذا کسی عقیدہ، نظریہ یا مسلک کے متعلق یہ کہنا کہ چونکہ اکثریت اس کے حق میں ہے اس لئے وہ برحق ہے؛ مغرب کے نظامِ جمہوریت کے تو مطابق ہے لیکن قرآن کریم کے یکسر خلاف۔ کیا یہ مقامِ حیرت نہیں کہ مغرب کے مفکرین تو اس اصول کو باطل قرار دے رہے ہیں اور ہمارے ہاں کے مدعیانِ اقامتِ دین اسے حق کا معیار بتا رہے ہیں؟ مغرب کا مشہور مفکر برٹا اس باب میں لکھتا ہے:۔

ایک انسان کا دوسرے انسان پر اقتدار و اختیار خواہ وہ کسی رنگ میں ہو استبداد ہے۔ قوت کسی شکل میں ہو اس کے یہی نتائج ہوں گے۔ وہ جاہ و منصب کی ہو یا پنجۂ فولادکی۔ دولت کی ہو یا ذہنی برتری کی۔ کسی افسر کی ہو یا حاکم کی، کسی پادری کی ہو یا پروہت کی۔ قوت بہرحال قوت ہے اور فساد کی جڑ۔ اس کا لازمی نتیجہ ظلم اور بیدادگری ہوتا ہے۔ ان سب میں سب سے زیادہ خراب قوت وہ ہے جو اکثریت محض اپنی تعداد کے زور پر اقلیت کے خلاف استعمال کرتی ہے۔

ص۲۶۳ (THE MAKING OF HUMANITY)

قرآن کریم کا ایک ارشاد ہے جس پر غور کرنے سے ایک مسلمان کپکپا اٹھتا ہے۔ وہ ارشاد یہ ہے:۔

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ (۱۲/۱۰۶)

ایمان کا دعویٰ کرنے والوں میں سے اکثر کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس دعوے کے باوجود مشرک کے مشرک ہی رہتے ہیں۔

میں نہ کسی کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کیا کرتا ہوں نہ کسی کو مشرک قرار دیا کرتا۔ میں اس قسم کی جرأت کے خلاف خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ لیکن قرآن کریم جن امور کو شرک قرار دیتا ہے ان کی وضاحت فریضۂ خداوندی سمجھتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سی ایسی بنیادی گمراہی ہے جس سے انسان دعوئے ایمان کے باوجود مشرک کا مشرک رہتا ہے؟ اس کی وضاحت قرآن کریم نے خود ہی کر دی۔ سورۃ الزمر میں ہے:۔

وَإِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ (۳۹/۴۵)

جب خالصتاً خدا کے قانون کی بات کی جاتی ہے تو جو لوگ آخرت کے منکر ہیں انہیں یہ بات سخت ناگوار گزرتی ہے۔ لیکن جب اس کے ساتھ اوروں کو بھی ملا دیا جائے تو وہ بہت خوش ہو جاتے ہیں۔

اس کی وضاحت اس سے اگلی سورۃ میں ان الفاظ میں کر دی کہ:۔

ذٰلِكُمْ بِأَنَّهُ إِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهُ كَفَرْتُمْ وَإِنْ يُشْرَكْ بِهِ تُؤْمِنُوا فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ (۴۰/۱۲)

تمہارا یہ انجام اس لئے ہوا کہ جب تمہیں خالصتاً خدا کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم اس سے انکار کرتے تھے لیکن جب اس کے ساتھ انسانوں کو ملا دیا جاتا تھا تو تم ایمان لے آیا کرتے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ حق حکومت

صرف خدا کو حاصل تھا۔ کبریائی بھی اسی کی تھی اور اقتدارِ اعلیٰ بھی اسی کا۔

یعنی لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶) وہ اپنے احکام میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ دوسری جگہ فرمایا:

اَمْ لَھُمْ شُرَکٰٓؤُا شَرَعُوْا لَھُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا لَمْ یَاْذَنْ بِہِ اللّٰہُ ..... (۴۲/۲۱)

کیا ان لوگوں نے خدا کے ایسے شریک مقرر کر رکھے ہیں جو ان کے لئے قوانین شریعت وضع کرتے ہیں حالانکہ اس کے لئے خدا نے کوئی اجازت نہیں دی۔

یہ کون لوگ ہیں جو اللہ تعالےٰ کے اختیارِ مطلق میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اس کی وضاحت خود حضور نبی اکرمؐ نے فرما دی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ..... (۹/۳۱)۔ "ان اہلِ کتاب نے اپنے علماء اور مشائخ کو خدا سے ورے ہی خدا بنا رکھا ہے" تو ان کی طرف سے یہ اعتراض ہوا کہ ہم نے انہیں خدا تو نہیں بنا رکھا۔ اس کے جواب میں حضورؐ نے فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ یہ تمہارے لئے قوانینِ شریعت وضع کرتے ہیں۔ جسے یہ حلال قرار دے دیتے ہیں تم اسے حلال سمجھنے لگ جاتے ہو۔ جسے حرام کہہ دیتے ہیں تم اسے حرام سمجھ لیتے ہو۔ یہی تو انہیں خدا بنا دینا ہے!

اللہ تعالےٰ نے فرمایا تھا کہ اَوَلَمْ یَکْفِھِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْھِمْ ..... (۲۹/۵۱) "کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر یہ کتاب نازل کی ہے جسے ان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے"؟ یعنی اللہ تعالےٰ نے فرمایا تھا کہ کیا دین کے معاملہ میں کتاب اللہ کافی نہیں ہے؟ ہمارے احبار و رہبان (مذہبی پیشوا) سینے پر ہاتھ مار کر دھڑلے سے کہتے ہیں کہ یہ کتاب کافی نہیں۔ "مثلہ معہ" اس کے ساتھ اس کی مثل اور چیزیں بھی ضروری ہیں۔ کہا تو "مثلہ معہ" تھا — یعنی اس کے ساتھ اس کی مثل لیکن رفتہ رفتہ، "اس کے ساتھ" کا تصور ختم ہو گیا اور باقی صرف "خارج از قرآن" رہ گیا۔ چنانچہ اب دین کے لئے "خارج از قرآن" کافی قرار پا چکا ہے۔ قرآن کا نام تبرکاً باقی رہ گیا ہے۔

احکامِ خداوندی میں انسانوں کو شریک کرنے کے معنی یہ ہیں کہ جو منفرد خصوصیات احکامِ خداوندی کو حاصل ہیں انسانوں کے وضع کردہ قوانین و احکام کو انہی صفات کا متصف قرار دے دیا جائے۔ احکام و قوانینِ خداوندی کی بنیادی خصوصیات ابدیت اور لاتبدیلیت ہیں۔ یعنی وہ ہر زمانے میں نافذ العمل رہنے کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ اور ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ احکامِ فقہ کے مرتب کرنے والے آئمہ کرامؒ کا مقام کتنا ہی مقام بلند کیوں نہ ہو، ان کے احکام نہ ابدی ہو سکتے ہیں نہ غیر متغیر۔ انہیں ایسا قرار دینا قرآن کریم کی نصوصِ صریحہ کے مطابق شرک فی التوحید ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے انکار نہیں۔ خود مودودی صاحب بھی متفق ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال کیوں نہ ہو زمان و مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ (تفہیمات۔ حصہ دوم۔ صفحہ ۲۲)۔ انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کرے دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا کیونکہ انسانی عقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے (تفہیمات۔ صفحہ ۱۲۰)

اس کے برعکس:-

> تمام زمان و مکان قیود سے آزاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف خداوند عالم ہے جس کے پاس حقیقی علم ہے اور جس کے علم میں زمانہ کے تغیرات سے ذرہ برابر کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ (تنقیحات ۔ صفحہ ۱۲۰)

لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہ حضرات کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ! یہاں فقہی قوانین کو شریعتِ خداوندی کہہ کر نافذ کیا جا رہا ہے ظاہر ہے کہ یہ فقہ خدا کی نہیں، انسانوں کی وضع کردہ ہے۔ پھر ان فقہی قوانین پر اسلامی نظریاتی کونسل کے ارکان نے غور و فکر کیا۔ یہ بھی بہرحال انسان ہیں۔ لیکن دیکھئے کہ انسانوں کے ان مرتب کردہ قوانین کے متعلق کیا کہا جا رہا ہے؟ مودودی صاحب اپنے ان قوانین کے سلسلہ میں ایک انٹرویو میں کہا کہ اب ہمارا فریضہ یہ ہے کہ

> عوام الناس کو یہ احساس دلائیں کہ اب یہاں خدا کا قانون جاری کیا جا رہا ہے۔
>
> (ترجمان القرآن ۔ بابت اپریل ۱۹۷۹ء صفحہ ۱۳)

استغفراللہ، ہزار بار استغفراللہ۔ انسانوں کے مرتب کردہ قوانین کو خدا کا قانون کہنا ایسا شرک جلی ہے جس کی جسارت ہم جیسے گنہگاروں کے تو حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتی! اس قسم کی جسارت تو آئمہ فقہ نے بھی نہیں کی تھی۔ ان میں سے کسی نے بھی اپنی فقہ کو "قانونِ خداوندی" کہہ کر نہیں پکارا تھا۔ انہوں نے یہی کہا تھا کہ یہ ان کے اپنے مرتب کردہ قوانین ہیں۔ لہٰذا جو قوانین یہاں نافذ کئے جا رہے ہیں وہ حکومتِ پاکستان کے قوانین ہیں۔ قوانینِ خداوندی نہیں ہیں۔ قوانینِ خداوندی تو خدا کی کتاب میں ہوتے ہیں (اور ہیں)۔ قرآن کریم نے اہلِ کتاب کے متعلق کہا تھا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ: يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ..... (۲/۷۹) "یہ خود قوانین وضع کرتے ہیں اور انہیں قوانینِ خداوندی کہہ کر مشہور کرتے ہیں اور مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ کچھ مفاد حاصل کر لئے جائیں"۔ سوچئے کہ کیا یہاں بھی بعینہٖ یہی کچھ نہیں ہو رہا۔

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ ان قوانین کے نفاذ پر مودودی صاحب نے ایک بڑا اہم اعلان فرمایا تھا جو ان کی جماعت کے ترجمان "ایشیا" بابت گیارہ فروری ۱۹۷۹ء کے صفحہ نمبر ۹ پر شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے ان قوانین کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا تھا:۔

> انسانی قوانین کی خلاف ورزی کرنا اور چیز ہے اور خدا تعالیٰ اور رسولؐ کے قانون کو توڑنا بالکل ہی دوسری چیز ہے۔ اس سے تو آدمی کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے اور وہ خدا کے غضب کا مستحق بن جاتا ہے۔

سیکولر نظامِ حکومت میں انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت اختیار کی جاتی ہے، لیکن ان کی خلاف ورزی سے صرف سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ اس سے نہ انسان کا ایمان خطرے میں پڑتا ہے اور نہ ہی مجرم خدا کے غضب کا مستحق قرار

تھیاکریسی

پاتا ہے۔ لیکن یہاں یہ کیفیت ہے کہ قوانین تو انسانوں کے وضع کردہ ہی نافذ کئے جاتے ہیں، لیکن یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی خلاف ورزی سے نہ صرف سزا ہی ملتی ہے بلکہ انسان کا ایمان بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے اور اس پر خدا کا غضب بھی وارد ہوتا ہے۔

اسے کہتے ہیں تھیاکریسی جو انسانی غلامی کی شدید ترین اور بدترین شکل ہے اور جسے ختم کرنے کے لئے اقبالؒ اور

متضاد قوانینِ خداوندی

قائداعظمؒ نے مملکتِ پاکستان کو حاصل کیا تھا۔ انہوں نے بتکرار کہا تھا کہ اور کچھ ہو یا نہ ہو، پاکستان میں تھیاکریسی کو رائج نہیں ہونے دیا جائے گا جس میں مذہبی

پیشوا اپنے قوانین کو قوانینِ خداوندی کہہ کر منواتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ پاکستان میں فقہ حنفی کے ماننے والوں کی اکثریت ہے، اس لئے یہاں وہ فقہ خدا کا قانون ہے۔ ایران میں فقہ جعفریہ کے ماننے والوں کی اکثریت ہے اس لئے وہاں وہ فقہ خدا کا قانون ہے یعنی مسلمانوں کی دو آزاد مملکتوں میں دو ضوابطِ قوانین نافذ ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن (مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق) دونوں "قانونِ خداوندی" ہیں۔ سعودی عرب میں حنبلی فقہ (اسی اصول کے مطابق) خدا کا قانون ہے جو ان دونوں سے مختلف ہے۔ کل کو اگر مصر، مراکش، انڈونیشیا وغیرہ نے بھی اپنے ہاں فقہی قوانین نافذ کر لئے تو مالکی اور شافعی فقہیں بھی خدا کا قانون قرار پا جائیں گی جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہ ہے وہ اسلام جسے دنیا میں رائج کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے!

پاکستان میں شیعہ حضرات فقہ جعفری کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اگر ان کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا تو یہاں دو متوازی حکومتیں قائم ہو جائیں گی جن کا اپنا اپنا ضابطۂ قوانین ہوگا اور یہ دونوں "خدا کے قوانین" کہلائیں گے۔ اگر ان کا یہ مطالبہ منظور نہ کیا گیا تو ظاہر ہے کہ شیعہ حضرات فقہ حنفی کی خلاف ورزی کریں گے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ وہ قانون کے مطابق سزا کے مستوجب ہوں گے بلکہ (مودودی صاحب کے فیصلہ کی رو سے) ان کا ایمان بھی خطرے میں پڑ جائے گا اور وہ موردِ غضبِ خداوندی بھی ہوں گے۔ اور اگر شیعوں نے اکثریت حاصل کر لی تو پھر حنفیوں کا ایمان خطرہ میں پڑ جائے گا اور یہ مغضوب علیہ ہو جائیں گے۔ اس سے آپ یہ بھی دیکھئے کہ اس طرح خدا کا کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے؟ یہ تصور کہ اس کی خوشنودی یا غضب کا کوئی مستقل معیار نہیں۔ یہ لوگوں کی کثرت اور قلت پر منحصر ہے۔ آج ایک گروہ کو اکثریت حاصل ہے تو وہ منعم علیہ ہے۔ کل کو وہ اقلیت میں آ گیا تو اس پر خدا کا غضب وارد ہو گیا! اس سے خدا کا تصور (معاذ اللہ۔ صد بار معاذ اللہ) پارلیمان کے سپیکر کا سا سامنے آتا ہے جسے ہر اکثریت کو برحق قرار دینا پڑتا ہے۔ آج یہ اکثریت میں، کل وہ اکثریت میں۔ آج یہ حق پر، کل وہ حق پر!

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں مذہب کے نقاب میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے؟ ہمارے نزدیک یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں۔ یہ ایک سوچی سمجھی، پہلے سے طے شدہ اسکیم کا نتیجہ نظر آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی مملکت —— خواہ وہ برطانیہ، امریکہ اور بھارت کی نظامِ سرمایہ داری کی حامل ہو اور خواہ روس اور چین کی کمیونزم یا سوشلزم کی علمبردار۔ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتی کہ مسلمانوں کی کسی مملکت میں قرآنی نظام رائج ہو جائے۔ اس سے ان کے نظام تباہ ہو جانے ہیں۔ مطالبۂ پاکستان کے زمانے میں اس کا بار بار اعلان کیا گیا تھا کہ ہم ایک آزاد مملکت کا قیام اس لئے چاہتے ہیں کہ اس میں قرآنی نظام رائج کیا جائے۔ یہ تمام مملکتیں اس سے لرزہ براندام تھیں اور اسی بناء پر وہ تقسیمِ ہند کی مخالفت کرتی تھیں۔ لارڈ کرومر نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ:-

> اگر مسلمان ممالک آزاد ہونا چاہیں تو ہم ان کو آزاد کر دیں گے۔ لیکن اگر وہ اپنی اسلامی حکومت قائم کرنا چاہیں تو ہم ہرگز یہ برداشت نہیں کریں گے۔ (ہفتہ وار ایشیا مورخہ ۱۸ جولائی ۱۹۷۰ء)

تحریکِ پاکستان کے دوران ہندوؤں کے مشہور رہنما مسٹر منشی نے برملا کہا تھا کہ:-

> تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو

اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنا لیں جہاں طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے۔ (ٹریبیون۔ مورخہ ۲ر نومبر ۱۹۴۷ء)

اور تو اور مسٹر گاندھی تک یہ کہہ رہے تھے کہ :-

اگر مذہب کو علیٰحدہ رہنے دیا جائے۔ یعنی ایک نجی کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہِ عمل بھی مشترک ہو۔ (ہندوستان ٹائمز مورخہ ۹ رجون ۱۹۴۷ء)

قائد اعظمؒ کی وفات پر ہندوؤں نے اندازہ لگایا تھا کہ اب پاکستان کی پوزیشن کمزور ہو گئی ہے اس لئے اس سے سمجھوتے کی شکل پیدا ہو سکتی ہے۔ اس سمجھوتے کے متعلق روزنامہ ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۹ر اکتوبر ۱۹۴۹ء کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا تھا کہ :-

اگر پاکستان اسلامی اسٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ یہ ملکتیں اسے برداشت ہی نہیں کر سکتیں تھیں کہ پاکستان قرآنی مملکت بن جائے۔ جو جماعتیں مذہب کے نام پر تشکیل پاکستان کی مخالفت کر رہی تھیں وہ گزشتہ تیس سال سے پاکستان کے اندر رہتے ہوئے اس جدوجہد میں مصروف چلی آ رہی ہیں کہ یہ مملکت قرآنی نہ بننے پائے۔ تشکیل پاکستان کے بعد جس تیزی، شدت، کثرت اور وسعت سے "غیر اسلامی اسلام" اوّلیں اس ملک اور ثانیاً دیگر ممالک میں پھیلایا گیا ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ اس کے بالآخر نتائج کیا ہیں؟ اب ان کی یہ کوششیں بار آور ہو رہی ہیں اور انہوں نے یہاں تھیاکریسی کو مسلط کرنا شروع کر دیا ہے۔ یاد رکھئے! سیکولرازم کے مقابلہ میں اسلامی نظام کا قیام اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا تھیاکریسی کے نظام میں مشکل ہوتا ہے۔ سیکولرازم میں خدا کا انکار ہوتا ہے اس لئے مسلمان اسے ٹھنڈے پیٹوں قبول نہیں کرتے۔ تھیاکریسی میں اسی سیکولرازم کو خدا کا نام دے کر مسلط کیا جاتا ہے اس لئے عوام بہت جلد اس فریب میں آ جاتے ہیں اور پھر اس جال سے چھٹکارا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ ہے وہ مقام جہاں ہم آج کھڑے ہیں۔ ہماری بدنصیبی کی مثال تاریخ میں شاید ہی کہیں مل سکے۔ ہم نے یہ مملکت حاصل کی تھی کہ ہم انسانوں کی غلامی سے نجات پا کر اور ایک خدا کی چوکھٹ پر سر جھکا کر ساری دنیا کے آستانوں سے سرفراز آگے بڑھ جائیں۔ لیکن ہوا یہ کہ ہم انسانی غلامی کی اُن زنجیروں میں جکڑے گئے جن سے زیادہ محکم گرفت کسی زنجیر کی نہیں ہو سکتی۔

خواستم پیکاں برآرم، در جگر نشتر شکست

میں جانتا ہوں کہ یہاں مسلسل سازشوں سے ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ قرآن کریم کی آواز کسی کان تک پہنچنے نہ پائے۔ میں اس کے باوجود یہ آواز بلند کئے جا رہا ہوں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ کم از کم آنے والا مورخ اس حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب پائے کہ ان تمام شورشوں اور سازشوں کے باوجود ایک گوشہ ایسا بھی تھا جہاں

سے یہ آواز مسلسل اور متواتر بلند ہو رہی تھی کہ :-

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا
عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا
كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (۳/۷۸)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں —— خواہ وہ مقتدی ہو، خواہ حکمران، حتیٰ کہ وہ منصبِ نبوت پر بھی سرفراز کیوں نہ ہو —— کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے محکوم اور غلام بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہیے کہ تم اس کتاب خداوندی کی اطاعت سے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور اپنی فکر کا مرکز بناتے ہو فقط اللہ کے محکوم بن جاؤ۔

اس کا نام حقیقی آزادی ہے جس سے ہم محروم ہی نہیں پہلے سے بھی کوسوں دور ہیں۔

ٹپک اے شمع! آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے — سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

کیا کیا جائے؟

آخر میں سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے۔ میں اس سوال کے جواب کو کسی خاص خطۂ سرزمین تک محدود نہیں رکھنا چاہتا اس لئے کہ جو کچھ میں نے اوپر عرض کیا ہے وہ پاکستان تک محدود نہیں۔ اس وقت مسلمانوں کے تمام ممالک میں صورت حالات کم و بیش یہی ہے۔ اس لئے میں اپنے جواب میں یہ کہوں گا کہ جو مملکت بھی یہ چاہتی ہے کہ وہ ایک خدا کی محکومی اختیار کر کے، انسانوں کی ہر قسم کی محکومیت سے آزادی حاصل کرے ـ خواہ اس محکومیت کی شکل ملوکیت ہو یا آمریت ـ تھیاکریسی ہو یا عصرِ حاضر کا جمہوری نظام۔ اسے کرنا یہ ہوگا کہ۔

۱- اپنے آئین میں اعلان کرے کہ مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ قرآن مجید کو حاصل ہوگا۔

۲- مملکت کا فریضہ قرآنی احکام و قوانین، اصول و اقدار کو عملاً نافذ کرنا ہوگا۔

۳- یہ بات امت (مملکت کے مسلمان باشندوں) کے باہمی مشوروں سے طے کی جائے گی کہ ان اصول و قوانین کو بحالاتِ موجودہ نافذ کرنے کا طریق کار کیا ہوگا۔ اس مشاورت کی مشینری خود تجویز کی جائے گی۔ اس مجلس مشاورت کو آپ پارلیمان کہہ لیجئے۔ پارلیمان میں کوئی پارٹی نہیں ہوگی کہ قرآن کریم کی رو سے مذہبی فرقہ سازی یا پارٹی بازی شرک ہے۔ پارلیمان کی رکنیت کے لئے بنیادی شرط قرآنی احکام و اقدار سے واقفیت ہوگی۔

۴- یہ سوال پیدا ہو تا رہے گا کہ اگر پارلیمان میں اس بات پر اختلاف ہو جائے کہ جو کچھ طے کیا جا رہا ہے وہ قرآنی تعلیم کے مطابق ہے یا نہیں؛ یا عام افرادِ معاشرہ میں یہ خیال پیدا ہو کہ پارلیمان جو فیصلہ کر رہی ہے وہ قرآن کے مطابق نہیں تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ ملک کی عدالتِ عالیہ کے ارکان، ممتاز قانون دان حضرات اور قرآن کریم پر گہری نگاہ رکھنے والے اربابِ علم و بصیرت پر مشتمل ایک مجلس قائم کی جائے جس کے سامنے اختلافی امور پیش ہوں۔ اس مجلس کے ارکین اس شرط سے مشروط ہوں کہ وہ کسی خاص مسلک کو نہیں بلکہ قرآن مجید کو آخری سند و حجت تسلیم کرتے ہیں۔ وہ یہ طے کریں کہ قرآن کریم کے حکم کو عملاً نافذ کرنے کے لئے جو طریق کار تجویز کیا جا رہا ہے وہ ممکن العمل ہے اور قرآن کے کسی اصول سے ٹکراتا نہیں۔

حقائق و عبر

(۱) یہ ہے ہماری صحافت!

روزنامہ نوائے وقت کی اشاعت بابت ۳۰ رجون ۱۹۷۷ء میں حسب ذیل خبر صفحہ اوّل پر جلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہے۔

(۱) مولانا مفتی محمود پر قاتلانہ حملہ ناکام بنا دیا گیا۔

(۲) کھڈیاں میں دو افراد بھٹو کے حق میں اور حکومت کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے قومی اتحاد کے سربراہ پر حملہ آور ہوئے۔

(۳) ایک ملزم کو پکڑ لیا گیا دوسرا فرار ہو گیا۔ پولیس نے مقدمہ درج کر لیا۔

(۴) حکومت حملہ آوروں اور سرغنوں کا پتہ چلائے ——— میاں طفیل محمد

اس کے بعد اس قاتلانہ حملہ کی تفصیل ان الفاظ میں دی گئی :-

(نامہ نگار) جب مفتی محمود اور دیگر رہنما لاری اڈے کی طرف روانہ ہوئے، دو نوجوان روشن دین تیلی عرف روشی اور احمد دین تیلی ہاتھوں میں چھریاں لہراتے ہوئے بھٹو زندہ باد اور ضیا الحق مردہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے مولانا مفتی محمود کی طرف جھپٹے اور انہوں نے مفتی صاحب پر حملہ کرنے کے لئے وار کیا۔ پاکستان قومی اتحاد کے رضاکاروں نے روشن دین روشی کو جو مفتی صاحب کے قریب پہنچ چکے تھے قابو کر لیا۔ اس افراتفری میں دوسرا حملہ آور احمد دین تیلی جو روشی کا بھائی بیان کیا جاتا ہے چھری سمیت غائب ہو گیا۔ رضاکاروں نے روشی کو مع چھری پولیس تھانہ کھڈیاں کے حوالے کر دیا جس نے دونوں کے خلاف ..... مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی۔

میاں طفیل محمد امیر جماعت اسلامی پاکستان نے مولانا مفتی محمود پر قاتلانہ حملے کی شدید مذمت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ خبر میرے لئے انتہائی صدمے کا باعث ہے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مفتی صاحب کو دشمنوں کے ارادوں سے محفوظ رکھا۔ اس حملے سے صاف واضح ہے کہ پیپلز پارٹی کے لوگوں کی طرف سے انتقام انتقام کی جو صدائیں بلند کی جا رہی تھیں وہ خالی دھمکیاں نہیں بلکہ ان کے پیچھے باقاعدہ منصوبہ بندی ہے یہ پارٹی تشدد کی پیداوار ہے، تشدد ہی پروان چڑھی ہے اور تشدد ہی سے اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنے کے درپے ہے۔ میں حملہ آوروں کو اصل مجرم نہیں بلکہ آلۂ کار سمجھتا ہوں۔ حکومت کا فرض ہے کہ اس سازش کے آلۂ کاروں کے ساتھ اس کے سرغنوں کا بھی پتہ چلائے اور ان کو بھی کیفر کردار تک پہنچانے کا انتظام کرے۔

خبر، اس کی تفصیلات، اس کے خلاف ردعمل، سب آپ نے دیکھ لیا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے یہ خبر روزنامہ نوائے وقت کی ۳۰ رجون کی اشاعت کے صفحہ اوّل پر اس کے اپنے نامہ نگار کے حوالے سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے بعد ۱۱ جولائی ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں اخبار

کی یکم جولائی کی اشاعت کے صفحہ اوّل پر حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے :

مفتی محمود نے قاتلانہ حملے کی تردید کر دی

پاکستان قومی اتحاد کے سربراہ مفتی محمود نے بعض اخبارات میں شائع ہونے والی ان خبروں کی تردید کی ہے کہ ان پر کھڈیاں میں قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ آج ایک بیان میں کہا کہ مجھے عوام کی حمایت حاصل ہے اس لئے کوئی شخص بھی ایسے احمقانہ اقدام کی جرأت نہیں کرتا۔ انہوں نے اخبار نویسوں سے کہا کہ وہ ایسی غلط خبریں شائع کرنے سے گریز کریں کیونکہ اس طرح سے سیاسی جماعتوں کے درمیان نفرت پیدا ہو سکتی ہے۔

اسی اخبار کے صفحہ نمبر ۴ پر مولانا گلزار احمد مظاہری کا ایک بیان شائع ہوا ہے جس کی جلی سرخی حسبِ ذیل ہے۔

مولانا مفتی محمود پر قاتلانہ حملہ گہری سازش کا آئینہ دار ہے۔

نوائے وقت نے مفتی صاحب کا تردیدی بیان شائع کرتے وقت، نہ یہ لکھا کہ یہ خبر خود اسی اخبار میں شائع ہوئی تھی اور نہ ہی اس پر کسی معذرت کا اظہار کیا۔ اس کے برعکس مفتی صاحب کے تردیدی بیان کے شانہ بشانہ مولانا گلزار احمد مظاہری کا احتجاج بھی شائع کر دیا اور وہ بھی بلا تبصرہ۔

اور طرفہ تماشا یہ کہ اسی اخبار کی ۲ جولائی کی اشاعت میں پھر ایک تفصیلی خبر شائع ہوئی جس میں کہا گیا کہ پولیس کس طرح اس واردات کے ملزموں کا چالان عدالت میں پیش کر رہی ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا، ہمیں علم نہیں۔ تحریر نمودہ ۸ جولائی ۱۹۷۹ء)

ہم اس تمام واقعہ پر اس سے زیادہ کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے کہ اگر نوائے وقت میں شائع شدہ خبر صحیح تھی تو مفتی صاحب کے تردیدی بیان کی بابت کیا کہا جائے۔ اور اگر ان کا تردیدی بیان صحیح تھا تو ان خبروں کے متعلق کیا کہا جائے جو یکے بعد دیگرے نوائے وقت میں شائع ہوتی رہیں۔ اور مقطع کا بند یہ کہ خدا اس قوم کی حالت پر رحم کرے جس کے ذرائع معلومات اس قسم کے ہوں۔

---

(۲) بالآخر اعتراف کرنا ہی پڑا

جب فروری ۱۹۷۹ء میں، ملک میں شرعی قوانین نافذ ہوئے ہیں تو ہم نے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے، منجملہ دیگر امور لکھا تھا کہ

آپ سوچئے کہ تفتیشی اور عدالتی مشینری تو ویسے کی ویسی رہے اور سزائیں کڑی کر دی جائیں زیادہ سخت تو کیا اس سے جرائم کی اصلاح ہو جائے گی؟ اصلاح تو ایک طرف اس سے خرابی اور بھی بڑھ جائے گی۔ بات واضح ہے اگر کسی جرم کی سزا (مثلاً) تین ماہ قید ہو تو اس میں رشوت کا "ریٹ" ہزار پانچ سو سے زیادہ نہیں ہوگا لیکن اگر اس جرم کی سزا ہاتھ کاٹ دینا یا سنگسار کر دینا ہو تو رشوت کا ریٹ آسمان سے باتیں کرنے لگ جائے گا۔ ملزم اپنا گھر بار بیچ کر بھی رشوت کا مطالبہ پورا کرے گا۔ اس ایک مثال سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ تفتیشی مشینری اور نظامِ عمل کی اصلاح کے بغیر سزاؤں کی سختی کیا نتائج پیدا کرے گی۔

(طلوعِ اسلام بابت فروری ۱۹۷۹ء صفحہ ۱۵)

اس پر مذہبی پیشوائیت کی طرف سے شور مچا دیا گیا، یہ لوگ چاہتے ہی نہیں کہ ملک میں شرعی قوانین نافذ ہو جائیں اسی لئے

یہ ان کے خلاف اس قسم کے اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ اب سنیئے کہ مفتی محمود صاحب کیا فرماتے ہیں بیچ اس مسئلہ کے۔ انہوں نے پارٹی ورکرز سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

اسلامی قوانین کی تنفیذ سے قوم پر خدا کی رحمتوں کی بارش تو کوئی نہ ہوئی البتہ پولیس کی رشوت کا ریٹ بہت اونچا چلا گیا۔ (پاکستان ٹائمز مورخہ ۲۹ رجون ۱۹۷۹ء دمشہ)

مفتی صاحب نے اپنے اسی خطاب میں یہ بھی فرمایا کہ

یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ شرعی قوانین کو نافذ ہوئے قریب پانچ ماہ ہو گئے لیکن جرائم کے ارتکاب میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ یہ اس لئے کہ شرعی قوانین کو نافذ نہیں کیا جا رہا۔ مقدمات کو شرعی قوانین کے بجائے جہاں سے زیادہ سخت سزائیں مل سکتی ہیں انہیں عام عدالتوں میں دائر کیا جاتا ہے۔ جرائم کا انسداد اسی صورت میں ممکن ہے کہ صرف شرعی عدالتیں رکھی جائیں اور دوسری سب عدالتیں بند کر دی جائیں۔ (ایضاً)

ان حضرات کی مشکل یہ ہے کہ ان پر ہمیشہ جذبات غالب رہتے ہیں جس کی وجہ سے یہ حقائق کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔ ان کا پہلا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ ہر خرابی کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال کر عوام کو ان کے خلاف مشتعل کر دیا جائے اور خود بری الذمہ ہو جائیں۔ مفتی صاحب محترم اگر حقائق کو اپنے سامنے رکھتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ جس خرابی کی انہوں نے نشاندہی کی ہے وہ خود ان شرعی قوانین کے اندر موجود ہے جو ملک میں نافذ کئے گئے ہیں۔ حکومت کے اعلامیہ میں جہاں شرعی حدود نافذ کئے گئے ہیں ان کے ساتھ ہی موجودہ فوجداری قوانین بھی درج ہیں اور کہا گیا ہے کہ اگر کوئی جرم شرعی قوانین کی شرائط کی رو سے ثابت نہ ہو سکے تو اس کا فیصلہ ملک کے رائج الوقت قانون کی رو سے کیا جائے۔ شرعی قوانین میں اثبات جرم کے لئے جو شرائط رکھی گئی ہیں ان کے مطابق شاید ہی کوئی جرم ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کا اعتراف اور اظہار خود صدر مملکت نے اپنے ایک انٹرویو میں فرمایا تھا۔ پولیس کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی تفتیش کی رو سے جس قانون کے مطابق جرم کا ثابت ہونا ممکن ہو اسی قانون کے تحت وہ عدالت میں چالان پیش کریں۔ یہ بات ایک مثال کی رو سے سمجھئے۔ جرم زنا کے ثبوت کے لئے قانون شریعت کی رو سے چار ایسے گواہوں کی ضرورت لاینفک ہے جنہوں نے اس فعل کے ارتکاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اور تزکیۃ الشہود کی شرط کی رو سے یہ عینی شاہد بھی پاکیزہ سیرت کے حامل ہونے چاہئیں۔ ہم ان حضرات سے پوچھتے ہیں کہ کیا ان شرائط کی رو سے کسی تفتیشی افسر کے لئے ممکن ہے کہ وہ اپنے چالان میں اس جرم کا ثبوت پیش کر سکے؟ ان حالات میں اس کے لئے اس کے سوا چارہ کار کیا رہ سکتا ہے کہ وہ اس مقدمہ کو ملک کی عام عدالت میں پیش کرے جہاں اثباتِ جرم کا امکان ہو سکتا ہے۔

کیا محترم مفتی صاحب ارشاد فرمائیں گے کہ ان مقدمات کو شرعی عدالتوں کے بجائے عام ملکی عدالتوں میں دائر کرنے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ پولیس اور بیوروکریسی پر یا خود ان شرعی قوانین پر؟ مفتی صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ انسدادِ جرائم کے لئے ضروری ہے کہ عام عدالتیں بند کر دی جائیں اور مقدمات کے فیصلے صرف شرعی عدالتوں میں ہوں۔ کیا مفتی صاحب فرمائیں گے کہ صدیوں پر مشتمل فقہی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا ملتا ہے جس میں کسی شرعی عدالت میں چار عینی شہادتوں کی بنا پر جرم زنا ثابت ہوا ہو؟ یہ تو غنیمت ہے کہ یہاں

ملکی عدالتیں موجود ہیں جہاں سے اب بھی ملکی قانون کی رو سے مجرموں کو سزا مل جاتی ہے۔ اگر یہ عدالتیں بند ہو جائیں تو نہ کوئی جرم ثابت ہو سکے نہ کسی مجرم کو سزا مل سکے!

(۳) اہلِ حدیث کی طرف سے

جب زکوٰۃ اور عشر کے مجوزہ قوانین کے خلاف شیعہ حضرات نے احتجاج کیا تھا تو ہم نے لکھا تھا کہ ابھی تک تو یہ اختلاف شیعہ حضرات اور سنیوں میں ہے۔ آگے چل کر آپ دیکھئے گا کہ خود سنیوں میں سے اہلِ حدیث کی طرف سے اس سے بھی زیادہ سخت احتجاج ہوگا۔ ان سطور کی تسوید کے وقت تک زکوٰۃ اور عشر سے متعلق ضابطۂ قوانین کا اعلان نہیں ہوا لیکن جماعت اہلِ حدیث کی طرف سے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہو گئی ہے۔ روزنامہ مساوات مؤرخہ ۲۱ جون ۱۹۷۹ء میں شائع شدہ ذیل کی خبر ملاحظہ فرمائیے:۔

مرکزی جمعیت اہلحدیث نے اعلان کیا ہے کہ اگر ان کے مطالبات تسلیم نہ کئے گئے تو تقریباً ایک کروڑ اہلحدیث افراد اہلِ تشیع کی طرح بنکوں سے رقوم نکلوانے کے سوال پر غور کریں گے۔ تنظیم کے مرکزی امیر مولانا معین الدین لکھوی نے آج یہاں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے استفسار کیا کہ آیا صدرِ مملکت اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں کہ عشر و زکوٰۃ کی شرائط نصاب اور مصارف کے مسئلہ میں جس طرح اہلِ تشیع کو اہلِ سنت سے اختلاف ہے اسی طرح زکوٰۃ و عشر کے بیسیوں مسائل میں اہلحدیث کو فقہ حنفی سے اختلاف ہے۔ صدر نے مرکزی و صوبائی زکوٰۃ و عشر کونسلوں کا جو اعلان کیا ہے اس میں عدالت ہائے عالیہ کے ججوں کے تحت قانونی اور فنی ماہرین کے ساتھ شیعہ بریلوی اور دیوبندی علماء کو نمائندگی دی گئی ہے لیکن جماعت اہلحدیث کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا ان کونسلوں میں مسلک اہلِ حدیث کی نمائندگی کوئی نہیں کرے گا۔ انہوں نے کہا حنفی علماء چاہے بریلوی ہوں یا دیوبندی فقہ حنفی سے ہی رہنمائی حاصل کریں گے اور شیعہ ارکان فقہ جعفریہ سے، لیکن حدیث نہ فقہ حنفیہ کو واجب العمل سمجھتے ہیں اور نہ فقہ جعفریہ کو۔ ان کے نزدیک صرف قرآن اور حدیث واجب التعمیل ہیں۔ ان حالات میں کونسلوں کے طے کردہ قاعدے اور ضابطے اہلحدیث کے نزدیک نہ تو کسی اہمیت کے حامل ہوں گے اور نہ کسی اعتماد کے قابل۔

(۴) ہندی مسلمان

انجمن ترقی اُردو (ہند) کے سیکرٹری ڈاکٹر خلیق انجم آج کل اپنے عزیزوں سے ملنے کے لئے پاکستان تشریف لائے ہوئے ہیں۔ اقبالؒ اکیڈمی پاکستان میں ایک چائے کی تقریب پر انہوں نے جن خیالات کا اظہار فرمایا وہ ڈاکٹر محمد باقر صاحب کے قلم سے ہفت روزہ چٹان کی ۹ جولائی ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں شائع ہوئے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق

انہوں نے بتایا کہ ان کی تعداد دس کروڑ کے قریب ہے لیکن کسی ایک صوبے یا مرکز میں ان کی اکثریت نہیں۔ انہوں نے کہا کہ

سماجی طور پر ہندی مسلمان عقب ماندہ آدمی بن کر رہ گیا ہے۔ وہ تعلیم سے بے بہرہ ہوتا جا رہا ہے اور کسبِ معاش کے دروازے اس پر آہستہ آہستہ بند کئے جا رہے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ کلرخ اندازی کو اپنا شعار بنا کر اپنی بے چینی کا اظہار کرتا ہے۔

خلیق صاحب کا بیان ہے کہ

ہندوستان میں حالیہ فسادات اور مالی نقصانات یا ان لوگوں نے کئے ہیں یا راشٹریا سیوک سنگھ یا جماعت اسلامی نے کئے ہیں۔ راشٹریا سیوک سنگھ کے جو جلسے ہوتے ہیں ان میں اسٹیج پر نمایاں طور پر جماعت اسلامی کے راہنما بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور ہندوستان میں یہ دونوں جماعتیں اپنے کثیر سرمائے اور افرادی قوت سے مسلمانوں کے خلاف متحدہ محاذ بنا کر برسرِ پیکار ہیں۔ ان دونوں جماعتوں کے پاس بے انتہا دولت ہے۔

سیاسی نظام کے متعلق وہاں کا مسلمان کس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہو رہا ہے وہ بھی سن لیجئے!۔

خلیق صاحب نے فرمایا کہ، دنیا میں کوئی مملکت نہ مذہب کے نام پر قائم ہوئی ہے نہ قائم رہ سکتی ہے۔ ہندوستان کی حکومت سیکولر یعنی غیر مذہبی حکومت ہے اس لئے لبرل اور کامیاب ہے۔ آپ پاکستان میں صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتے ہیں کہ آپ مذہب کو صرف نجی یا انفرادی عقیدے کے طور پر بحال رکھیں۔ مذہب کو زبردستی قوم پر تھوپنے کے نتائج خطرناک نکل سکتے ہیں اور ایسی حکومت یا ملک کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ ہندو نے مذہب کو کبھی سیاست میں دخیل نہیں ہونے دیا اور وہ اسی لئے کامیاب ہے۔

"مذہب" کے متعلق خلیق صاحب جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ اس میں حق بجانب ہیں اور دین کا تصور ان کے ذہن میں آ نہیں سکتا کیونکہ دین کا نظام نہ ہندوستان میں ہے نہ پاکستان میں۔

مذہب کے معاملہ میں ہندی مسلمان کس پست درجے تک پہنچنے پر مجبور ہو رہا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ خلیق صاحب نے فرمایا کہ میری بیوی ہندو ہے۔ گھر میں مورتیوں کی پوجا کرتی ہے۔ دوسرے کمرے میں میری والدہ نماز پڑھتی ہے۔ مجھے تو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی اور ہندوستان میں یہی ہو رہا ہے۔ یہی لبرل اسلام ہے..... ہندوستان میں زیدی کی صاحبزادی (بیرسٹر بخاری کی سالی فدسیہ کی لڑکی ہے جو دو نسلوں سے کم از کم سیدوں کی اولاد ہے) نے ہندو سے شادی کی ہے۔ ہندوستان میں تو اسے کسی نے برا نہیں جانا کیونکہ ہم ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔

اگر تحریکِ پاکستان کے دوران مفتی محمود صاحب کی جمعیت علماء ہند اور جماعت اسلامی کی کوششیں کامیاب ہو جاتیں تو آج ہندوستان میں ہم سب کا یہی حال ہوتا۔

ضروری اعلان طلوعِ اسلام کے لئے جملہ رقوم مثلاً منی آرڈر، چیک، بینک ڈرافٹ وغیرہ "ناظم ادارہ طلوعِ اسلام" کے نام بھیجی جائیں کسی کے نام سے کوئی رقم نہ بھیجی جائے۔ رقم کو (260-A/c) حبیب بینک (برانچ مین مارکیٹ) گلبرگ II لاہور میں جمع کرنے کی ہدایت کے ساتھ پتہ انگریزی زبان میں:- (MANAGER IDARA TOLU-E-ISLAM, 25-B GULBERG-II LAHORE, PAKISTAN) لکھا جائے۔

"ناظم"

وارثانِ منبر و محراب کی خدمت میں

مرحوم آغا شورش کاشمیری نے ۷ رجون ۱۹۷۱ء کو ایک اداریہ تحریر فرمایا تھا جس کا عنوان تھا۔

وارثانِ منبر و محراب کی خدمت میں

قرآن ہر زمانے کے مطابق بولتا ہے

شرعی صورتوں سے زیادہ اس وقت شرعی سیرتوں کی ضرورت ہے!

(اس اداریہ کو مؤقر جریدہ چٹان نے اپنی اشاعت بابت ۲۳ اپریل ۱۹۷۹ء میں دوبارہ چھاپا ہے۔ اسے اس جریدہ کے شکریہ کے ساتھ درجِ ذیل کیا جاتا ہے۔ مولوی صاحبان، آغا شورش مرحوم کو اپنے مخالفین کی صف میں بہرحال شمار نہیں کرتے تھے۔ اس لئے ہمیں امید ہے کہ ان کی زبان سے یہ حقائق پڑھ ہی ان حضرات کو ناگوار نہیں گزرے گی۔)

(o)

ابھی پچھلے دنوں لاہور میں دو تین سیرت کانفرنسیں ہوئی ہیں ان میں بعض قابلِ احترام اور جید و متبحر علماء شریک ہوئے سب نے اپنے موضوع پر نہایت مرصّع تقریریں کیں۔ ان کانفرنسوں میں ہم نے تین باتیں پائیں۔

پہلی بات حشر کا جو اجلاس (سامعین) کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل تھی جو اسلام کے موروثی پیروکار ہیں۔ اور وہ تذکرہ سیرت کی ان محفلوں کو ثوابِ دارین پر محمول کرتے لیکن اسلام کا معاشرہ سے مطالبہ کیا ہے اس سے قطعاً ناواقف ہیں۔

دوسری بات اکثر تقریریں [illegible] وعظ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کا عصرِ حاضر اور اسلام یا دعوتِ رسالت اور

عصری سیاست کے مسائل سے کوئی تعلق نہ تھا عام خیال یہ ہے۔ اور یہ بھی بڑی حد تک قرینِ صداقت کہ ہمارے یہ علماء "قرآن ہر زمانے کے مطابق بولتا ہے" کی سچائی سے قطعاً بے بہرہ ہیں۔ یہ علماء سے کہیں تذکرۂ اسلام کے داستان گو ہیں۔ ان کا بلکہ کسی بھی روایتی عالمِ دین کا مسلمانوں پر کوئی اجتماعی اثر نہیں ہے۔

تیسری بات۔ گو خشندہ سیاستدانوں کے نزدیک۔ چنانچہ ان کا واحد جرم یہ ہے کہ وہ اسلام کا نام لیتا اور اس کا غلبہ چاہتا ہے۔ لیکن شخصی احترام کے باوجود ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان علماء کی ننانوے فی صد اکثریت ایسی ہے کہ ہمارے دل میں ان کے لئے دینی احترام مفقود ہے ـــــ ہم اسلام سے براہِ راست آگاہ نہ ہوتے تو ان بزرگوں کا وجود ہی اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ نئی نسلیں اسلام سے کٹ رہی ہیں۔ اس کی وجہ خود ہمارے علماء (وارثانِ منبر و محراب) کا وجود ہے۔ یہ کس سنتِ نبویؐ کی تلقین کرتے ہیں جس پر خود عمل نہیں کرتے! شرعی صورتیں بنانا ہی تو اسلام نہیں، شرعی سیرتیں بنانا بھی اسلام ہے اور حقیقی اسلام! لیکن یہ اسلام کتنوں میں ہے؟ اس شخص کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پیوند لگے ہوئے کپڑوں کا ذکر کرتے ہوئے حیا نہیں آتی! جو وضع و قطع کے لحاظ سے دولہا بن کر پچیس سے پچاس ہزار کے موٹر پر سوار ہو کر محفلِ وعظ میں آتا فاقۂ رسالتؐ کی حکایت چھیڑتا اور ریشم و حریر پہنتا ہے۔ وہ لوگ اخلاقِ نبویؐ کا سبق کیا دے سکتے ہیں جن کی زبانِ شریعت ترجمان خرافات سے لدی پھندی ہوتی ہے؟ وہ نسلیں کیونکر ان سے مطمئن ہو سکتی ہیں جنہیں نانِ جویں تک میسر نہیں۔ لیکن جنہیں معلوم ہے کہ حضورؐ کے ستو اور کھجور کا ذکر کرنے والے پورا مرغ ہضم کر جاتے ہیں اور جن کے دسترخوانوں پر کئی کئی کھانے ہوتے ہیں۔ ہم کسی فردِ واحد کسی متعین جماعت یا کسی شخصی کردار کو سامنے رکھ کر یہ بحث نہیں کر رہے البتہ یہ مقصود بحث ہی ہے ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں ایک اجتماعی سرشت اور ایک خاص ذہنیت سے متعلق لکھ رہے ہیں۔

مسجدوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ لوگ جس کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں اس پر منفی تبصرے کرتے، خطبہ لمبا ہو جائے تو پھر مذاق اڑاتے حتیٰ کہ عیدین میں جس کے پیچھے نماز پڑھتے اس کے خطبے یا دعاؤں کی نوعیت پر اُن کے چٹکلے اڑاتے ہیں۔ ہم پچھلے دنوں دو تین دوستوں کے جنازہ میں شریک ہوئے تو جنازہ کی نماز میں امام سے متعلق بعض لوگوں کو کسمساتے پایا۔ انہیں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ امام نمازِ جنازہ سے متعلق لوگوں کو بتائے بس جلدی کرو تاکہ ہم جائیں۔ وہ نسل جو پچھلے دس پندرہ برس میں جوان ہوئی ہے اس کی ایک خاص تعداد متنفر ہے۔ ایک بڑی تعداد بیزار ہے اور ایک غالب تعداد ہے کہ تاریخِ اسلام میں ان بزرگوں کا وجود گورکن سے زیادہ کوئی مرتبہ یا معنی نہیں رکھتا!

حقیقت یہ ہے کہ ان کی وجہ سے مذہب کا احترام ختم ہو گیا اور اب مذہب کا احترام نہ ہونے کے باعث ان کا احترام باقی نہیں رہا۔ دکانیں رہ گئی ہیں مال نہیں رہا، جسم رہ گیا ہے، روح نہیں رہی، ہم وہ لوگ ہیں جو محکمات (متشابہات) پر ایمان رکھتے ہیں۔ متشابہات کیا ہیں؟ خدا کی ذات و صفات ملائکہ کا وجود و نبوت، مرنے کے بعد زندگی، عذاب و ثواب، دنیا کی ابتداء، پیدائش (کن فیکون) اور عالمِ آخرت

کے احوال و واردات وغیرہ ۔ لیکن جن وارثانِ منبر و محراب کا ہم نے مشاہدہ و تجربہ کیا ہے ان میں دو چار گنے چنے اکابر کو چھوڑ کر باقی جمِ غفیر عالمِ غیب (غیر محسوسات) ایک طرف رہا عالمِ شہادت (محسوسات) کا یقین بھی نہیں دلا سکتا۔

ایک مسلمان کا سفرِ زندگی اس دنیا میں ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ موت، حیاتِ اُخروی کی ابتدا ہے۔ ہم ایسوں کی واحد آس حضورؐ سرورِ کائنات کی رحمۃ اللعالمینی ہے۔ ہمارا شرف یہ ہے کہ ہم ان کی امت میں ہیں ہمارے پاس ورثہ انبیاء نہیں، نہ ہم رسولؐ کے وارث ہیں، نہ ہم نے تفسیر و سیرت کی دوکان لگائی ہے ہم کسی مدرسہ کے شیخ الحدیث نہیں نہ ہماری زندگی تقویٰ و علم کا سراپا ہے ؎

نہ فاضلیم نہ مدرس نہ محتسب، نہ فقیہہ

لیکن ہم جانشینانِ مسندِ رسالتؐ اور منبر و محراب سے نہایت ادب کے ساتھ یہ عرض کرنا اپنا فرض سمجھتے کہ اسلام نئے فلسفوں کی کربلا میں نواسۂ رسولؐ کی طرح کلمہ گوؤں کی شقاوت کا شکار ہے۔ نئی نسل کی دینی حسیات معرّیٰ ہو گئی ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آخرت کا خوف باقی نہیں رہا۔ اور آخرت کا تصور ہی ایک ایسی چیز ہے جو اخلاق پیدا کرتا ہے۔ جن قوموں میں اخلاق نہیں وہ آتشِ دوزخ کی طرح تپتی اور چراغِ گورِ غریباں کی طرح بجھ جاتی ہیں۔

یہ اداریہ ایڈیٹر کے قلم سے ہے جو کچھ لکھا سوچ سمجھ کر لکھا اور انشراحِ صدر کے ساتھ لکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دو سال میں علماء کے زہد و ورع کو ان کے قول و قرار اور تقویٰ و علم کو ان کے زبان و بیان کی ترازو میں تولا تو عقیدت کا برائے نام بند تو بھی ختم ہو گیا۔

ہم اپنے اس لازوال یقین کا اعادہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ علماء کی موجودہ کھیپ کا نوے فی صد عنصر نئی نسلوں کو اسلام کی دعوت دینے کا اہل ہی نہیں۔

ایڈیٹر چٹان تو ان کے قرب پر جہنم کی آگ کو ترجیح دیتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے عذاب سے بچائے۔

——— (۰) ———

طلوعِ اسلام

آغا شورش مرحوم نے یہ کچھ سنہ ۱۹۷۱ء میں کہا تھا۔ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو :
کیا جانئیے کیا کہتے ۔ کیا دیکھتے ۔ کیا کرتے !

خریدار صاحبان
(۱) پرچہ نہ ملنے کی اطلاع ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک دے کر پرچہ دوبارہ حاصل کریں۔
(۲) جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ بھیجنا نہ بھولئے۔ (ناظمِ ادارہ)

(قسط ۸)

احتساب

(احتساب کی ساتویں قسط، طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۹ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اب اس سلسلہ کی اگلی کڑی ملاحظہ فرمائیے۔ یہ بھی ۱۹۵۵ء کی داستان کا مسلسل حصہ ہے)

ہماری قومی نشرگاہیں

قومی نشرگاہ (ریڈیو اسٹیشن) ایک مملکت کی تعمیرِنو اور عوام کی ذہنی تربیت میں جو فریضہ انجام دے سکتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے ممکن نہیں۔ لیکن ریڈیو پاکستان کے اربابِ انتظام نشریات کی صورت میں جو کچھ پیش کرتے چلے آرہے تھے وہ اس نوزائیدہ مملکت اور اس کے عوام کی تعمیر و تربیت کے بجائے مایوس کن ذہنی عیاشیوں کا سرچشمہ ثابت ہو رہا تھا۔ تاریخ کی بساط پر اُبھرتی ہوئی ایک نئی مملکت اور نئی قوم کے نشوو ارتقاء سے یہ مضحکہ خیزی ناقابلِ برداشت تھی۔ طلوعِ اسلام نے اس معاملے میں حتی الامکان ضبط سے کام لیا اور آخر ایک دن اس کا قلم حرکت میں آہی گیا۔ ریڈیو پاکستان کے اربابِ انتظام کی ذمہ داری اور اس کی اہمیت واضح کرنے کے بعد اپنے مقالہ میں اس نے لکھا:

ریڈیو عوامی تعلیم و تربیت کا ایک عمدہ اور مؤثر ذریعہ ہے۔ اس کی افادیت ان علاقوں میں خصوصیت سے بڑھ جاتی ہے جو پسماندہ اور غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ کیونکہ اسکول کی تعلیم کا ذریعہ بہرحال دقّت طلب بھی ہے اور وقت طلب بھی۔ ریڈیو کا گاؤں گاؤں میں نصب کرکے کسی آواز کو ملک کے گوشے گوشے میں اور ایک ایک فرد تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارا ریڈیو یا تو برسرِ اقتدار حکومت کا نقیب ہے اور یا عوام کو ان کی موجودہ سطح پر جامد رکھنے کا ذریعہ۔ یعنی اس نے وزیروں کے بیانات اور تقریریں نشر کرنے اور حکومت کے اقدامات اور منصوبوں کی قصیدہ خوانی کرنے ہی کو اپنا فریضۂ زندگی بنائے رکھا ہے۔ ایسی مثالیں کم ملتی ہیں کہ اس نے ان مقاصد کا شعور پیدا کرنے کی کوشش کی ہو جو قیامِ پاکستان کا محرک ثابت ہوئے اور جن کی تکمیل کے بغیر پاکستان کا مطلب کچھ نہیں ہوگا۔ جہاں تک اس کے مذہبی اور فنونِ لطیفہ سے متعلق پروگراموں کا تعلق ہے اس کی کوشش یہ رہتی ہے کہ ان میں کوئی ایسی بات نہ آنے پائے جس سے عوام کا معیار بلند ہو سکے۔ اس کے برعکس اسے پست سے پست سطح تک لے جایا جائے۔

اس کی ذمہ داری ان وزیروں پر عائد ہوتی ہے جو وقتاً فوقتاً اس کا انصرام سنبھالتے رہے اور اس حکومت پر بھی جس کے وہ وزیر یا ارکان تھے۔ ہمیں افسوس ہے کہ پاکستان کی مختلف حکومتوں نے اس پر مطلقاً توجہ نہیں دی کہ ریڈیو کے ذریعہ پاکستان کے طول و عرض میں زندگی کی نئی لہر دوڑائی جا سکتی ہے۔ اور عوام کی ذہنی و قلبی سطح کو بلند سے بلند تر کیا جا سکتا ہے، انہوں نے اسے ذاتی اور احزابی ضروریات کے لئے استعمال کیا۔ اور بس!

(شمارہ ۱۹ نومبر ۱۹۵۵ء۔ صک)

شاہ سعود اور کشمیر

نومبر میں شاہ سعود کے دورۂ بھارت کی خبر منظرِ عام پر آئی اور اس کے ساتھ یہ روح فرسا اطلاع بھی کہ انہوں نے مقبوضہ کشمیر کو بھی اپنے دورے میں شامل کر لیا ہے۔ مرکزِ اسلام کے یہ حکمران اس سے قبل پاکستان کے مفاد کے خلاف جس روش کا ثبوت دے چکے تھے اور اس کی روشنی میں ان کا دورۂ کشمیر جن افسوسناک نتائج پر منتج ہو سکتا تھا، طلوعِ اسلام نے اسے منظرِ عام پر لانا ضروری سمجھا۔ مسئلہ کشمیر کی اہمیت واضح کرتے ہوئے اس نے شاہ سعود کو ایک حقیقت کشا انتباہ کیا اور لکھا۔

"اسرائیل اور کشمیر دونوں عالمِ اسلامی کے رِستے ہوئے ناسور ہیں۔ پاکستان نے ان دونوں خطروں کو بھانپ لیا ہے اور ان کے مقابلے کے لئے وہ پوری طرح تیار ہو رہا ہے۔ لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑے گا کہ دیگر ممالکِ مسلمہ نے بالعموم اور ممالکِ عربیہ نے بالخصوص کشمیر کے تباہ کن مضمرات کو کماحقہٗ محسوس نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب جہاں یہودی سلطنت کو زندگی اور موت کا سوال سمجھتے ہیں وہاں کشمیر کو چنداں شائستہ اعتنا نہیں سمجھتے۔ حالانکہ بادنیٰ تعمق دونوں مسائل کے مسلمانانِ عالم کے لئے، زندگی اور موت کے مسائل ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

یوں تو کسی مسلمان ملک کی طرف سے بے اعتنائی کا مظاہرہ ہو، ہمارے لئے وہ قلبی اضطراب کا باعث ہو گا۔ لیکن جب شاہ نجد و حجاز بھی اس رَو میں بہہ جائیں، تو ہیجان و اضطراب کی حد نہیں رہتی۔ کیونکہ متولیٔ کعبہ ہونے کی وجہ سے ان کی حیثیت بڑی قابلِ احترام ہے۔۔۔۔۔ عرب کے ساتھ اس شیفتگی نے شاہ عرب کو مخصوص حیثیت عطا کر دی ہے۔ فلہٰذا انہیں اپنے قول و فعل میں بڑا محتاط ہونا چاہیئے۔۔ کیونکہ ان کا اثر مسلمانانِ عالم پر کہیں گہرا پڑتا ہے۔ اندریں حالات شاہ سعود کا کشمیر جانے کا فیصلہ بڑا کرب انگیز ہے۔ اور یہ تاثر مسلمانانِ پاکستان ہی کا نہیں ان مظلومینِ کشمیر کا بھی ہے جو آٹھ سال سے ہندوستانی مظالمِ بے پناہ کا شکار چلے آ رہے ہیں۔

(شمارہ ۲۶ نومبر ۵۵ء صک)

یہ حقائق و تاثرات پیش کرنے کے بعد طلوعِ اسلام، اسلامی اخوت کے تقاضوں کی بنا پر دعوتِ فکر

دیتا ہے اور سوال کرتا ہے کہ

> ہم شاہ سعود سے یہ پوچھنے کی جسارت کرتے ہیں کہ اگر کہیں وزیر اعظم پاکستان "اسرائیل" کا دورہ کرنے جائیں تو ان کے قلب پر کیا گذرے گی۔ اگر وہ اس کو برداشت نہیں کر سکتے تو اہلِ پاکستان ان کے کشمیر کے دورے کو بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کے دل میں ان کا اس قدر احترام ہے کہ پچھلے دنوں جب انہوں نے ان ترکی جہازوں کو عربی علاقے میں اترنے یا اس پر سے گزرنے کی اجازت نہیں دی جو پاکستان کے سیلاب زدگان کے لیئے ضروری امداد لا رہے تھے تو انہوں نے اُف تک نہیں کی تھی۔ اب اگر وہ حرفِ شکایت زبان پر لا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اب وہ خاموش نہیں رہ سکتے۔
>
> (ایضاً)

جمہوریت اور اس کی کارفرمائیاں

جمہوریت کی بحالی کا نعرہ ہمارے ہاں بڑے زور و شور سے بلند ہوتا رہا۔ اور اس کے نعرے فضا میں مرتعش رہے۔ لیکن جمہوریت ہے کیا؛ اس کے متعلق کوئی واضح تصور ہمارے ہاں عوام کے سامنے نہ لایا جا سکا۔ ۱۷ دسمبر ۱۹۵۵ء کے طلوعِ اسلام میں یہی اہم موضوع، واقعات و حقائق کی روشنی میں سامنے آیا۔ طلوعِ اسلام نے اس اجمال کی تفصیل پیش کرتے ہوئے لکھا:۔

> جمہوریت، ڈیماکریسی (DEMOCRACY) کا ترجمہ ہے۔ اس کے معنی ہیں۔ "لوگوں کی حکومت" یا "عوام کی حکومت"۔ اس کا مفہوم انگریزی کے اس مشہور فقرے میں ادا کیا جاتا ہے جو امریکی دستور کی بنیاد قرار دیا گیا ہے یعنی "عوام کی حکومت۔ عوام کے فائدے کے لیئے۔ خود عوام کے ہاتھوں سے"۔ مغربی اقوام میں، جمہوری حکومت فی الواقعہ عوام کی حکومت، عوام کے فائدے کے لیئے، خود عوام کے ہاتھوں تشکیل پاتی ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق دو آرا ہوں یا نہ ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ہشت سالہ تجربہ نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے وہ یہی ہے کہ یہاں حکومت نہ عوام کی ہوتی ہے نہ عوام کے فائدے کے لیئے ہوتی ہے۔ اور نہ ہی عوام کے ہاتھوں تشکیل پذیر ہوتی ہے۔ یہ خواص کی حکومت۔ خاص مفاد کی خاطر، خواص کے ہاتھوں متشکل ہوتی ہے۔
>
> (شمارہ ۱۷ دسمبر ۱۹۵۵ء صـ۳)

اس نے یہ بھی بتایا۔۔ کہ ہمارے ہاں جمہوری نظامِ حکومت کی بدولت کس قسم کے تلخ نتائج سامنے آئے۔ سنیئے!

> گزشتہ آٹھ برس سے خود ہمارے ہاں جمہوری نظامِ حکومت کارفرما ہے۔ ہم "اللہ کے فضل و کرم سے" براہِ راست اس کے عواقب و ثمرات سے لذت اندوز ہو رہے ہیں۔ ہماری سیاسی حالت، معاملات میں آئے دن کا تجربہ، معاشرہ کی چیخ و پکار، قوم کی زبوں حالی۔

قدم قدم پر زندگی کی ہڈیاں چٹخنے کی دردانگیز آوازیں۔ حتیٰ کہ خود اس جمہوری حکومت کے اربابِ بست و کشاد کے اعلانات کہ ہمارے ہاں، رشوت، بددیانتی، نالائقی، اقربانوازی، اعزہ پروری، انفرادی مفاد پرستی کی لعنت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ ہم حکمرانوں کے ایک گروہ سے تنگ آکر نئے انتخابات کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن نئے انتخابات کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ انہی جیسا ایک اور گروہ ہم پر مسلط ہو گیا ہے۔ (ایضاً)

پاکستان میں جمہوری نظام سے یہ تلخ ثمرات کیوں منتج ہوئے۔ اس اہم سوال کا جواب دیتے ہوئے طلوعِ اسلام نے انتخابی کوائف کی تفصیل پیش کی اور یہ بتایا کہ

اس طریقِ کار کا عملی نتیجہ دیکھئے! فرض کیجئے دس گاؤں کا ایک حلقۂ انتخاب ہے جس میں پچاس ہزار کاشتکار (مزارع) ہیں اور پچاس زمیندار۔ اس حلقہ کی ایک نشست کے لئے پانچ زمیندار کھڑے ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک زمیندار (امیدوار) کامیاب ہوتا ہے۔ کہنے کے لئے یہ زمیندار، ان پچاس ہزار کاشتکاروں کا نمائندہ ہے۔ لیکن سوچئے کہ ایک زمیندار کسی طرح بھی کاشتکاروں (مزارعین) کا نمائندہ بن سکتا ہے؟ زمیندار اور کاشتکار کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ کیا اس صورت میں ایک زمیندار کبھی کاشتکاروں کے مفاد کا محافظ ہو سکتا ہے؟ اسی طرح کارخانوں کی مثال لیجئے .... ان حلقوں کو پھیلا کر، پورے ملک کو محیط کر لیجئے۔ ملک کی آبادی میں نوّے (بلکہ اس سے بھی زیادہ) فیصد حصہ غریبوں کا ہے اور باقی دس فی صد (بلکہ اس سے بھی کم) امیر ہیں۔ انتخاب کے لئے (کم و بیش تمام) امیدوار اسی دس فی صد (امراء کے) حلقہ سے کھڑے ہوتے ہیں اور ان میں سے کامیاب امیدوار مجالسِ مقننہ وغیرہ کے رکن بن جاتے ہیں۔ کیا آپ ان ممبروں کو ملک کی نوّے فی صد غریب و نادار آبادی کا نمائندہ قرار دے سکتے ہیں؟ کیا یہ "جمہور" عوام کے مفاد کے محافظ و نگران سمجھے جا سکتے ہیں؟ کیا ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ اپنے مفاد پر عوام (جمہور) کے مفاد کو ترجیح دیں گے؟ لہٰذا جب یہ منتخب شدہ ممبر، جمہور کے نمائندے ہی نہیں تو اس اندازِ حکومت کو جمہوری (DEMOCRATIC) کہا کیسے جا سکتا ہے؟ (ایضاً)

اس تفصیل کے بعد طلوعِ اسلام نے، صورتِ حال کی اصلاح کے لئے یہ بنیادی حل تجویز کیا:۔

اس فساد کا علاج (ایک بڑی حد تک) انتخابی مشینری کی اصلاح میں ہے اور وہ اصلاح یہ ہے کہ ملک کی سو نشستوں میں سے نوّے نشستیں عوام کے لئے مخصوص ہونی چاہئیں اور دس خاص (امراء) کے لئے۔ عوام (غریبوں) کی نشستوں سے صرف عوام (کاشتکار، مزدور، غریب) امیدوار کھڑے ہوں، اور خواص کی نشستوں کے لئے خواص (زمیندار، کارخانہ دار (امراء) نہ عوام ان خواص کو ووٹ دے سکیں۔ نہ خواص ان عوام کی نشستوں

میں دخیل ہو سکیں۔ اس طرح، صرف اس طرح عوام کی صحیح نمائندگی ہو سکے گی۔ اور اس طرح حکومت کو جمہوری (عوام کی) حکومت کہا جا سکے گا۔ (ایضاً)

مسئلہ کشمیر اور روس کا چیلنج

وزیرِاعظم چوہدری محمد علی صاحب کی دعوت پر پاکستان کے ہر مکتبِ فکر کے ممتاز رہنماؤں کی ایک نمائندہ کانفرنس دارالحکومت کراچی میں ہوئی اور سب رہنماؤں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ کشمیر کو بھارت کے چنگل سے نجات دلانے کے لئے ٹھوس اقدامات عمل میں لائے جائیں۔ آل پارٹیز کشمیر کانفرنس کے اس اعلان کی روشنائی ابھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ سفارتی آداب کے تقاضوں اور سلامتی کونسل کے فیصلوں کے احترام کو پسِ پشت ڈال کر روس میدان میں کود پڑا۔ روس کے وزیرِاعظم مارشل بلگانن اور وہاں کی کمیونسٹ پارٹی کے آمرِ مطلق مسٹر خردشیف نے جو انہی ایام میں بھارت اور افغانستان کے دورے پر آئے تھے، پے در پے پاکستان کے خلاف یہ بیان بازی شروع کر دی کہ کشمیر ہندوستان کا حصہ ہے، اس کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ ایک طرف یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ اور دوسری طرف پاکستان کے دوست (امریکہ وغیرہ) جن کی خاطر پاکستان کو اس صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا، منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ یہ صورتِ حال بڑی نازک تھی اور اس کا تجزیہ اشد ضروری۔ اس فریضہ کو ادا کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے ۱۷ دسمبر کے ایک مقالہ میں لکھا:۔

> کشمیر کا مسئلہ پاکستان اور ہندوستان کے مابین متنازعہ فیہ ہے اور جب تک اس کا فیصلہ نہیں ہو جاتا کسی ملک کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسے کسی ایک ملک کا حصہ قرار دے۔ روس کے تعلقات ہندوستان سے ہیں تو پاکستان سے بھی۔ اس لئے ڈپلومیٹک آداب کا تقاضا ہے کہ اس کے دل میں جو کچھ بھی ہو، وہ بات غیر ذمہ داری سے نہ کرے، نیز کشمیر کا مسئلہ اقوامِ متحدہ کے پیشِ نظر بھی ہے اور روس اس ادارے کا رکن ہونے کی حیثیت سے، مجبور ہے کہ ایسی واضح جانبداری کا مرتکب نہ ہو۔ لیکن روس نے نہ پاکستان سے ڈپلومیٹک تعلقات کا لحاظ کیا، نہ اقوامِ متحدہ کی رکنیت کی ذمہ داری کو محسوس کیا۔ ان حدود کا احترام ایک طرف، وہ بالکل آپے سے باہر ہو گیا اور پاکستان کی تخلیق ہی پر معترض ہونے لگا۔ مہذب ممالک اس قسم کے اعلانات کو ضروری بھی سمجھیں تو اس وقت کرتے ہیں جب وہ برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔ لیکن روس کے رنگ نیارے ہیں۔ وہ قاعدے کے مطابق پاکستان کا دوست ہے۔ (جب تک دونوں ممالک کے مابین سفارتی تعلقات قائم ہیں انہیں ایک دوسرے کا دشمن نہیں کہا جا سکتا)۔ لیکن وہ اس کی اساس تک پر اعتراض کرنے سے نہیں چوکا۔ اگر روس پاکستان کو دشمن نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے تو اسے تعلقات منقطع کر کے اپنے آپ کو یاوہ گوئی کے لئے آزاد کر لینا چاہیئے۔
>
> (۱۷ دسمبر ۱۹۵۵ء، صفحہ ۵)

اس کے بعد آزادیٔ کشمیر کے پُرجوش قومی عزم کا اعلان کرتے ہوئے تجزیئے کا یہ رُخ امریکہ اور حکومتِ پاکستان کی طرف مڑتا ہے اور زندگی و موت کے اس اہم مسئلہ میں وہ (طلوعِ اسلام) مصلحت پسندی کے تار و پود بکھیرتے ہوئے لکھتا ہے :-

سوال پیدا ہوتا ہے کہ روس کے اس صریح اعلان کے بعد امریکہ کی پوزیشن کیا رہ جاتی ہے؟ یہ سوال اس لئے پیدا نہیں ہوتا کہ ہم کشمیر کی قسمت امریکہ کے ہاتھ میں سمجھتے ہیں، بلکہ اس لئے کہ ہم پر روسی عتاب کا نزول اس لئے ہو رہا ہے کہ ہم امریکہ کے حلیف ہیں۔ اگر ہمیں امریکہ سے حلیفانہ تعلقات قائم کرنے کی یہ سزا مل سکتی ہے تو ہم امریکہ سے یہ توقع کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ وہ صاف صاف بتائے کہ وہ ہمیں کیا مقام دینے کے لئے تیار ہے؟ .... اگر امریکہ نے صاف طور پر پاکستانی مؤقف کی حمایت نہ کی تو پاکستان اپنے لئے جداگانہ راستہ تراشنے پر مجبور ہو جائے گا۔ امریکہ اگر یہ چاہتا ہے کہ پاکستان اس کا ساتھ دے تو اسے چاہیئے کہ وہ یہ موقع پیدا ہونے نہ دے کہ پاکستان اضطراراً کچھ کر بیٹھے ....

امریکہ اس کا کچھ بھی جواب دے۔ پاکستان کی حکومت اور عوام کو یہ راز سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ کشمیر بڑی شدت سے ہمارے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا ہے۔ کشمیر مظہر بن گیا ہے ان مخالفانہ سازشوں کا جن کا جال ہندوستان اور روس .. بچھاتے جا رہے ہیں۔ لہٰذا کشمیر ہماری قومی جدوجہد کا فیصلہ کن معرکہ ہوگا۔ اسے سر کرنے کے لئے کامل اتحاد و یکجہتی کی ضرورت ہے۔ جو افراد و احزاب کشمیر کانفرنس میں شریک ہوئے تھے اگر ان کی شرکت واقعی خلوص پر مبنی تھی اور وہ کشمیر کے حصول .... کے لئے دیانتدارانہ تڑپ رکھتے ہیں تو اب وقت آگیا ہے کہ وہ اس مقصد کے لئے یک زبان، یک نگاہ اور یک جان ہو جائیں کہ

یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ (ایضاً)

اگلے شمارہ میں طلوعِ اسلام نے ایک بار پھر پاکستان کی زندگی اور موت کے اس اہم مسئلہ پر قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس ہوا اور اقوامِ متحدہ اور امریکہ کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے لکھا :-

اس کے جواب میں انہیں (اقوامِ متحدہ اور امریکہ کو) یہ بتانا ہوگا کہ وہ اس چیلنج کے تقاضے کیسے پورے کریں گے۔ مثلاً کیا اقوامِ متحدہ اس کے لئے تیار ہے کہ چونکہ روس نے کشمیر کے بارے میں فریقِ مقدمہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے اس لئے اس معاملے میں اسے رائے دینے کا حق نہیں دیا جا سکتا؛ یا کیا امریکہ اس کے لئے تیار ہے کہ ہندوستان اب بھی استصواب سے پہلو تہی کرے تو اقوامِ متحدہ کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے قواعد کے مطابق اس رکن ملک کے خلاف مناسب کارروائی کرے؛ اگر وہ اس مؤثر عملی اقدام کے لئے تیار نہیں تو

پاکستان کی زبانی ہمدردی سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کشمیر پاکستان کے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اب جبکہ ہم اس مرحلے تک آ پہنچے ہیں کہ ایک روس نہیں، کئی روس بھی آ دھمکیں تو ہمیں اس آگ میں کودنے سے نہیں روک سکتے۔ یہ آگ ہماری زندگی کو موت کے گھاٹ اتار دے گی یا اسے زندہ تر کر دے گی۔ ہمارا عمل اس کا خود فیصلہ کر دے گا۔ اس کے متعلق ہم امریکہ کو یہ جتا دینا چاہتے ہیں کہ اگر خدا نخواستہ پاکستان، روس کی روشن کی ہوئی آگ کی نذر ہوگیا، تو امریکہ کو بھی ان شعلوں سے پناہ نہ مل سکے گی۔ (شمارہ ۲۴ دسمبر ۵۵ء۔ صفحہ ۱۶)

بڑھتی ہوئی انتظامی خرابیاں

ملک کی انتظامی مشینری کی بڑھتی ہوئی خرابیاں باعث ہیجان و اضطراب بنتی جا رہی تھیں اور ہر شخص کے لبوں پر یہ سوال ابھر رہا تھا کہ حکومت ان خرابیوں کی اصلاح پر توجہ کیوں نہیں دے رہی؟ طلوع اسلام نے ایک اہم مقالہ میں اس سوال کا جواب دیا۔ مقالہ کا عنوان تھا۔ تو اے کبوتر بام حرم چہ می دانی؟

سنئے کہ اس مقالہ میں اس نے کیا لکھا:۔

اس میں شبہ نہیں کہ نظم و نسق کی خرابیوں کی وجوہات متعدد ہیں لیکن ان میں ایک وجہ ایسی ہے جو بالکل بین ہے۔ اور وہ یہ کہ ہمارے ارباب اقتدار کو اس کا علم اور احساس ہی نہیں ہوتا کہ عوام کن مشکلات سے دوچار ہیں اور ان کی زندگی کس طرح سے اجیرن ہو رہی ہے۔۔۔۔۔۔ زندگی کے کسی گوشے کو بھی لیجئے اس کے متعلق حاکم اعلیٰ کو کبھی معلوم ہی نہیں ہونے پاتا کہ عوام کو کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اپنے کام بغیر کسی قسم کی دقت اور دشواری کے سرانجام پاتے جاتے ہیں۔ عوام کی حالت سے باخبر رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ان حضرات کا عوام کے ساتھ ربط رہے۔ وہ اپنے آپ کو عوام میں کا ایک اور عوام انہیں اپنے میں کا ایک سمجھیں۔ لیکن اس قسم کا ربط تو ایک طرف۔ ان میں اور عوام میں اس قدر بُعد اور بے گانگی ہوتی ہے کہ عوام کی کوئی بات ان کے گوش مبارک تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔۔۔۔۔۔ یاد رکھئے! جن لوگوں کے ہاتھوں میں عوام کی تقدیریں دی جائیں جب تک وہ سمیع و بصیر اور خبیر و علیم نہ ہوں وہ اپنی ذمہ داریوں سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ وہ ہر شکایت کے جواب میں اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ لوگ نظم و نسق کی خرابیاں بیان کرنے میں خواہ مخواہ مبالغہ کرتے ہیں۔ ان سے کون کہے کہ

تو اے کبوتر بام حرم چہ می دانی　　　طپیدن دل مرغان رشتہ بر پا را

(شمارہ ۳۱ دسمبر ۵۵ء۔ صفحہ ۱)

(۰)

معراجِ انسانیت

سیرت صاحب قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) خود قرآن کے آئینے میں۔ مفکر قرآن پرویز صاحب کا بلند پایہ شاہکار۔ عقل و عشق، فکر و نظر، دل اور دماغ کا حسین امتزاج۔

اس سیرت طیبہ کے مطالعہ سے مقام محمدی اور انقلاب محمدی نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ حسن معنوی کے ساتھ صوری پاکیزگی بھی دیدہ زیب۔ بڑی تقطیع۔ اعلیٰ سفید کاغذ۔

ضخامت پانصد صفحات۔ دلکش مضبوط جلد

قیمت :- ۴۵/- روپے

شاہکارِ رسالت
(عمرِ فاروق رض)

اسلام مذہب نہیں دین ہے۔ یعنی نظام حیات جو ایک آزاد مملکت میں پروان چڑھتا ہے۔ اس نظام کی تشکیل کا آغاز عہد نبویؐ میں ہوا، لیکن وہ اپنے عہد شباب تک خلافت فاروقی میں پہنچا۔ اسلام کو بحیثیت ایک نظام حیات دیکھنے کے لئے اس عہد کی صحیح تصویر محترم پرویز صاحب نے اپنی اس عظیم تصنیف (شاہکار رسالت) میں پیش کی ہے۔ اس کے آخری باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ عہد فاروقی کے بعد اسلام پر کیا گزری اور وہ کس طرح دین سے موجودہ مذہب میں تبدیل ہو گیا۔

ایک ضخیم کتاب — قیمت ۴۵/- روپے

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقل انسانی، زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے تک کے مفکرین مؤرخین اور سائنس دانوں نے کیا دیا ہے۔ اس کتاب سے یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ عقل انسانی کو وحی کی روشنی کی ضرورت کیوں ہے؟

یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دے گی۔ کتاب نہایت خوبصورت ٹائپ میں سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ قیمت۔ مجلد ۲۵/- روپے

کتاب التقدیر

انسان کی قسمت خدا کی مشیت اور غریب کی تقدیر سے کیا مفہوم ہے؟ کیا موت کا دن مقرر ہے؟ بعض بچے پیدائشی اپاہج کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ دعا کیا ہے اور کیا اس سے تقدیر بدل جاتی ہے؟ اس قسم کے بے شمار سوالات، ان کا جائزہ اور قرآن کریم کی روشنی میں ان کا حل آپ کو اس کتاب میں ملے گا۔ کتاب بڑے سائز کے چار سو سے زاید صفحات پر مشتمل ہے اور عمدہ سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔

جلد مضبوط (نقش ثانی)

قیمت ۳۰/- روپے

نوٹ :- ان قیمتوں میں محصول ڈاک شامل نہیں

ملنے کا پتہ

(۱) ادارۂ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

روزہ کے احکام

چونکہ رمضان المبارک کے مہینہ کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس لئے (معمول کے مطابق) قرآن کی رُو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کئے جاتے ہیں۔ یہ احکام سورۂ بقرہ میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں۔

(۱) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

(۱) اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پچھلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔ اسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔

(۲) اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ

(۲) یہ روزے گنتی کے دنوں کے ہیں۔

(۳) فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔

(۳) پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔

(۴) وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ۔

(۴) اور جو لوگ بہ دشواری روزے رکھ سکیں، ان کے لئے روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے۔

(۵) فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

(۵) اس کے بعد اگر کوئی اپنی خوشی سے زیادہ کرے تو مزید اجر کا موجب ہوگا۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے۔

(۶) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ۔

(۶) یہ روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔

۱؎ ان احکام کو اس سے پہلے بھی ہم کئی بار درج کر چکے ہیں۔ لیکن قارئین کے تقاضے کے پیشِ نظر انہیں دہرایا جا رہا ہے۔

(۷) فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ۔
(۲/۱۸۳-۱۸۵)

(۷) لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔

(۸) وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ۔ (۲/۱۸۷)

(۸) اور کھاؤ پیو، یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے متمیز ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ پورا کرو۔

(۹) أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ۔ (۲/۱۸۷)

(۹) اور تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے اختلاط حلال کیا گیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ

۱۔ روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا نو دن کے نہیں، بلکہ پورے مہینے کے)۔

۲۔ روزے ہیں، اس وقت سے لے کر جب صبح کی سفیدی نمودار ہو جائے، دن کے ختم ہونے تک کھانا، پینا اور بیوی سے اختلاط منع ہے۔

۳۔ روزے اس کے لئے ہیں کہ جو اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔

۴۔ اب ایک شکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص (عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہے نہ مسافر ہے لیکن کسی وجہ سے، اسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے اور مریض بھی نہیں۔ لیکن بڑھاپے یا کسی مزمن مرض کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔ ایسے لوگوں کا حکم آیت نمبر ۶ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، انہیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ وہ روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

غور فرمائیے کہ اوپر کی تینوں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہو گئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ کا ترجمہ ـــــ وہ لوگ جو بہ دشواری روزہ رکھ سکیں ـــــ کیا ہے۔ لیکن اس کا عام ترجمہ ـــــ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ـــــ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ اس ترجمہ کی رو سے مطلب یہ ہو گا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو وہ روزے رکھا

کریں۔ ظاہر ہے کہ قرآن کا منشا یہ نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ "طاقت" کا جو مفہوم ہمارے ہاں اُردو میں رائج ہے وہ اس سے مختلف ہے جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس کے لئے عربی زبان کی لغات دیکھئے۔ محیط المحیط جلد دوم صفحہ ۱۳۰۴ میں ہے۔

"طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں جسے انسان بہ مشقت کر سکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اُس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے؛ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجا لانا ہمیں دشوار ہو۔"

اسی طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب صفحہ ۱۰۳ جلد ۱۲ میں ہے کہ

طاقت، قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بہ مشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہ، اپنی تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵ جلد ۲ میں فرماتے ہیں کہ

اِطَاقَۃٌ دراصل مُکْنَتٌ اور قُدْرَتٌ کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب اَطَاقَ الشَّیْءَ صرف اس وقت کہتے ہیں جب اس کی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو۔ یعنی بہ دشواری اُسے برداشت کر سکتا ہو۔ چنانچہ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اور وہ لوگ ہیں جو انہیں کی طرح معذور ہیں۔ یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خُدا نے پُر مشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ اسی بنا پر امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لئے بہ مشقت ممکن ہو۔

اس کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ

طَاقَۃٌ کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنہیں بہ تکلیف یا بہ مشقت کیا جا سکے اور وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر یہ آیت ثابت ہے منسوخ نہیں ہے۔ (تفسیر کشاف ص۲۵۵ جلد ۱)

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ

عربی زبان میں اَلْوُسْعُ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور طَاقَۃٌ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا، (آیۂ زیرِ نظر) کے معنی یہ ہوں گے۔ اور ان لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے۔

(روح المعانی صفحہ ۵۹، جلد ۲)

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ "طَاقَۃٌ" کا مفہوم کیا ہے اور اس بنا پر وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ کا ترجمہ ——— اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ——— صحیح نہیں ہو سکتا اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ——— جو لوگ بہ دشواری روزہ رکھ سکیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں، قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اُسے اُمّت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعین کرے۔ چنانچہ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ میں بھی یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جا چکی ہیں اور ان پر اب بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی کی کتاب "جامع احکام القرآن" (صفحہ ۲۶۸ - ۲۶۹ - جلد ۲) میں ہے کہ

> تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے، یا شدید مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں، ان کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمہ کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں۔ البتہ امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے۔ اور حضرت انسؓ، ابن عباسؓ، قیسؓ بن السائب اور ابوہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ——— ان لوگوں کے ذمہ فدیہ ہے، قضا نہیں ہے۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اور بھی اضافہ فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

> الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے یہاں مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی ان کے زمرے میں شامل ہو سکتے جو مزدوری پیشہ ہوں۔ جن کی معاش خدا نے پُرمشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لئے جاتے ہیں، اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو۔ تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جن کے دور ہو جانے کی کوئی امید نہ ہو، روزہ رکھنا گراں گزرتا ہو جیسے بڑھاپا اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقت کا سبب ہوتا رہتا ہے۔ جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت۔ ان سب لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔ (تفسیر المنار۔ صفحہ ۱۵۵ - ۱۵۷ - جلد ۲)

یہ ہیں روزوں کے احکام قرآنِ کریم کی رُو سے۔ ہم نے صرف احکام سے بحث کی ہے۔ روزے کا فلسفہ بیان نہیں کیا۔ وہ الگ موضوع ہے۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام لندن (انگلینڈ) ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)
M9 SUTTON COURT RD
LONDON E-13 — 9NR.
PHONE 01 — 552-1517

لاہور میں ہر جمعہ ۸ بجے صبح (فون 880800) ۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۳ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) دفتر چوہدری شاہنواز صاحب۔ عابد سلک انڈسٹریز (فون 30899) متصل اڈہ لاریاں (مالی دی جھگی)

کراچی ہر جمعہ کو ۱۰ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ کمرہ نمبر ۲۴ ہارون چیمبرز۔ الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی۔ کراچی ۲

گوجرانوالہ میں ہر جمعہ ۳ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) رہائش گاہ چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ سول لائنز (بالمقابل پرانا ریلوے اسٹیشن)

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) بر مکان۔ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیق لین صدر۔ بالمقابل دی آئی پی مین گیٹ۔ پشاور سٹیڈیم۔ بارہ روڈ

گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام بمقام ۱/۱/۱۲ بی بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) بر مکان ڈاکٹر رضا محمد خان۔ نواب علی روڈ

جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)

راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی ۱۶۶۔ لیاقت روڈ۔

ملتان میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔ (فون 72071)

لیّہ میں ہر جمعہ بعد نماز مغرب۔ رہائش گاہ ڈاکٹر اظہر ملک صاحب۔ سرکلر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

کراچی کے خریدار متوجہ ہوں!

کتب خانہ کے اوقاتِ کار حسبِ ذیل ہیں:۔
ہر روز (علاوہ جمعہ):۔ شام ۶ بجے تا ۸ بجے شب
جمعہ:۔ صبح ۹ بجے تا ۱۲ بجے دوپہر

نیز کتب خانہ میں ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات بھی دستیاب ہیں اور ایک آرڈر تحریر کرکے منگوائی بھی جا سکتی ہیں۔

محمد اسلام۔ کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ کمرہ نمبر ۲۴۔ ہارون چیمبرز، الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی، کراچی ۲

دین

اپنی مکمل، عملی شکل میں عہدِ فاروقیؓ میں قائم ہوا۔
اس کے کچھ عرصہ بعد یہ مذہب میں بدل گیا۔
دین کی وہ شکل کیا تھی اور یہ مذہب میں کیسے تبدیل ہو گیا؟ اس کی تفصیل پرویز صاحب
کی مایہ ناز کتاب

شاہکارِ رسالتؐ

میں ملے گی۔

قیمت مجلد -/۴۵ روپے ——— (علاوہ محصول ڈاک) ملنے کا پتہ

(۱) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور (۲) ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قتلِ مرتد

ہمارے ہاں جو خلافِ قرآن نظریات چلے آرہے ہیں ان میں ایک نظریہ یا عقیدہ یہ بھی ہے کہ جو مسلمان 'اسلام چھوڑ دے' اس کی سزا قتل ہے۔ اسلام چھوڑنے سے مراد یہی نہیں کہ وہ یہودی یا عیسائی ہو جائے۔ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ جس مسلمان کے متعلق علماء حضرات کہہ دیں کہ اس کے عقائد صحیح اسلام کے مطابق نہیں رہے (یعنی اس اسلام کے مطابق جسے وہ صحیح سمجھتے ہیں) وہ بھی واجب القتل ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے طلوعِ اسلام کی طرف سے ایک کتابچہ شائع ہوا تھا جس میں اس سراسر خلافِ اسلام نظریہ کے متعلق تفصیلی بحث کی گئی تھی۔ اس کتابچہ میں 'اسلام میں غلام اور لونڈیوں' کے متعلق بھی بحث آگئی تھی۔ اس لحاظ سے اس کا نام تھا!

قتلِ مرتد ——— اور ——— غلام و لونڈیاں

چونکہ آجکل قتلِ مرتد کے متعلق پھر سے آوازیں اٹھ رہی ہیں اس لئے اس کتابچہ کا مطالعہ بہت مفید رہے گا۔ ——— قیمت چار روپیہ علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور ⊖ مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

قرآنی قوانین

للہ الحمد کہ پرویز صاحب کی تازہ ترین تصنیف ——— قرآنی قوانین ——— ملک میں بے حد مقبول ہو رہی ہے اور اس کی افادیت نکھر کر سامنے آرہی ہے۔ اس سے نظر آتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو جائے گا۔ اگر آپ نے اسے ابھی تک حاصل نہیں کیا تو جلدی منگوا لیجئے۔

قیمت فی جلد مجلد بیس روپے (علاوہ محصول ڈاک) ملنے کا پتہ ★

ایک مدت کے انتظار کے بعد عصرِ حاضر کی نہایت اہم تصنیف

نظامِ ربوبیت (شائع ہو گئی)

(یہ پہلے ایڈیشن سے کہیں مختلف ہے)

آپ ایک مدت سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ اسلام نہ نظام سرمایہ داری کا حامی ہے نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا؟

مگر قرآنی ... پرویز صاحب کی اس تصنیف میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ:

(۱) نظامِ سرمایہ داری کیا ہے، کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں اور یہ کیوں ناکام رہ گئے ہیں۔

ان کے برعکس

(۲) اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسان کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے۔ اس کی روشنی میں یہ بھی بتایا گیا ہے۔

★ مارکس نے کس طرح یہ اعتراف کیا کہ اس کا نظام ناقابلِ عمل ہے ★ مادیت پرستی کا فلسفہ انسانوں کی بنیادوں کس طرح نااستوار ہیں۔

★ ربوا (سود) کا مسئلہ کیا ہے اور اس کا حل کیا ہے ★ زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم کیا ہے

اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پر کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔

کتاب آفسٹ کی چھپائی میں، ولایتی سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے ـــ ضخامت سوا چار سو صفحات ـــ سنہری جلد

قیمت فی جلد پچاس روپے ــــــ (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور ● مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

مصنف کی دیگر شہرہ آفاق کتابیں جن سے صحیح اسلام سمجھ میں آ سکتا ہے

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں بلکہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے علاوہ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی وسعت کیا ہے۔ قرآن مجید نے انسان کو کیا دیا ہے یہ اس کا کیا مقام متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ جو بصورت اعلیٰ عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے۔

قیمت:- فی جلد -/۳۰ روپے

مکمل سیٹ -/۱۲۰ روپے

تبویب القرآن

آپ کے ذہن میں کوئی سوال ہے اور آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس کی بابت قرآن مجید نے کیا اور کہاں کہاں کہا ہے تو اس کتاب سے آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا۔

اس کتاب میں قریب ڈیڑھ ہزار چار سو عنوانات ہیں اور ہر عنوان کے تحت ان قرآنی آیات کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں اس سے متعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ کچھ کہا گیا ہے۔ مصنف کی حالیہ [illegible] شائع شدہ کتاب ہے جو بڑے سائز کے ۱۵۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ عمدہ سفید کاغذ، آفسٹ کی چھپائی، تین مضبوط اور دیدہ زیب جلدوں میں۔

قیمت:- مکمل سیٹ -/۱۲۰ روپے

مفہوم القرآن

قرآن مجید مروجہ ترجموں اور عام تفسیروں سے سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ یہ اس طرح سمجھ میں آ سکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون سے متعلق مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے۔ مفکر قرآن پرویز صاحب نے پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے مرتب کیا ہے جو مفہوم القرآن کے نام سے مع متن، عمدہ دبیز کاغذ پر تین مطلا جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔

قیمت: فی جلد -/۴۰ روپے

مکمل سیٹ جلد -/۱۲۰ روپے

مطالب الفرقان

پرویز صاحب کے درس قرآن مجید کا سلسلہ گزشتہ تیس سال سے جاری ہے۔ اس میں ان کا انداز یہ ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے زمانہ کے محاورہ عرب اور تصریف آیات قرآنی سے آیات قرآنی کی جدید دور کے تقاضوں کے مطابق مسلسل تشریح کرتے چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ان درسوں کی بنیاد پر قرآن کریم کی تفسیر مرتب کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جس کا نام مطالب الفرقان ہے۔ ابھی تک اس کی دو جلدیں شائع ہوئی ہیں۔

عمدہ سفید کاغذ، پاکیزہ آفسٹ چھپائی۔

قیمت:- جلد اول -/۴۰ روپے جلد دوم -/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور